AFZAL

انارکلی

حرم سرائے مغلیہ کی شوکت و تجمّل میں ایک ناچیز کنیز کی داستانِ عشق۔ جس کے رقص نے ہندوستان کے تختِ سلطنت کو لرزا دیا۔ جس کے نغمے نے ایوانِ شاہی میں شعلے بھڑکا دئے۔ جس کے حُسن نے جگر گوشۂ مغلیہ کے حواس چھین لئے ؛

سید امتیاز علی تاؔج کا وہ ڈراما جسے ادب اور تھیئٹر کے سب ماہروں نے متّفقہ طور پر اُردو ڈراما میں ایک سنگِ میل قرار دیا ہے ؛

اُردو ادب کی کوئی لائبریری اس کتاب کے بغیر مکمل قرار نہیں دی جا سکتی۔ مولوی عنایت اللہ مرحوم مُہتمم تالیف و ترجمہ حیدر آباد دکن نے اس کتاب کے متعلق صحیح فرمایا ہے کہ "یہ ان کتابوں میں سے ہے جنہیں دیکھ کر پڑھ کر اور اپنے پاس رکھ کر خوشی ہوتی ہے" ؛

قیمت چار روپے آٹھ آنے صرف ؛

دارالاشاعت پنجاب لاہور

۷۰ ریلوے روڈ ؛

Taj Tahir Foundation

جملہ حقوق محفوظ

زلفی

T.T.F LIBRARY
No: 110

مصنفہ

محمد عنایت اللہ خاں بی۔ اے

مترجم تائیس۔ سلامبو۔ ہملٹ۔ آتھیلو۔ کنگ لیر۔ میکبتھ وغیرہ

باہتمام تاج و حجاب

۱۹۵۹ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

قیمت ۲؍ روپے ۸؍

بارِ نہم

حرم س
کی داستانِ ع
سلطنت کو ل
شعلے بھڑکا د
حواس چھین
سید ا
تھیئٹر کے س
ایک سنگِ م
اردو ا
مکمل قرار نہیں د
تالیف و ترجمہ
صحیح فرمایا ہے
پڑھ کر اور اپنے
قیمت
دارا

اہتمام .... تاج وحجاب

کتابت .... ملک علی محمد خوشنویس

آرٹسٹ .... محمد افضل آرٹسٹ

طباعت .... پاک پبلشرز پرنٹنگ پریس لاہور

طباعتِ سرورق .... نوروز پرنٹنگ پریس لاہور

قیمت .... دو روپے آٹھ آنے فی جلد

پبلشرز

دارالاشاعت پنجاب لاہور

دیباچہ

نوجوان احباب کی خدمت میں گذارش ہے۔ کہ آپ میں بعض تو وہ ہیں جن کو خود کچھ لکھنے کا شوق ہے۔ یہ احباب تو کسی دوسرے کے لکھے کو پڑھنا عذاب بلکہ عذاب سے بھی بدتر سمجھتے ہیں ؏

بعض دوست ایسے ہیں۔ جنہوں نے ایک خاص مذاقِ سخن پیدا کر لیا ہے۔ اور اس کے ایسے ہی پابند ہیں۔ جیسے کوئی اپنے مذہب کا پابند ہو۔ نئی تصانیف سے بالعموم اور انگریزی ترجموں سے بالخصوص انہیں نفرت ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی عداوت ہے۔ ان کی طبیعتیں نہایت نازک ہیں۔ جیسے سونے چاندی کے ورق ہوتے ہیں۔ کہ جہاں ذرا سی ہوا لگی۔ اور وہ ٹوٹے۔ اگر کوئی مبتدی (گو خود انہوں نے ابھی تک کچھ نہ شروع کیا ہو) کچھ لکھ کر ان کو سنانے بیٹھتا ہے۔ تو ان کا جی بیٹھنے لگتا ہے قلب کی حرکت بگڑ جاتی ہے۔ دل میں کہتے ہیں کہ یہ کم بخت کرکری روٹی کے نوالے بنا بنا کر ہمیں کھلانے کو کہاں سے آن مرا۔ اگر خدانخواستہ کہیں

Taj Tahir Foundation

کسی محاورہ میں غلطی کی یا کوئی متروک لفظ نادانستہ استعمال کر گیا۔ یا کہیں
کے کا کی ترکیب میں اُلجھن پڑ گئی۔ تو بس لکھنے والا قابلِ دار ٹھہرا۔ نہایت
تلاش و جُستجو سے کوئی ذکر ایسا چھیڑ دیا۔ کہ پڑھنے والا خاموش ہو گیا۔ یہ
دوست اپنے اخلاق کو اتنی وسعت نہیں دیتے۔ کہ دوسروں کی حماقتوں کو
سننے میں اپنا وقتِ عزیز ضائع کریں۔ گو اس "وقتِ عزیز" کا کوئی اور مصرف
بھی اس وقت نہ نکلتا ہو۔ ان کے نزدیک کسی کی بات کو سُننا ایسا بخل
ہے۔ جس کو سخاوت پر ترجیح دینا آسان ہے۔ یہاں تک تو کسی مضمون
کو مصنّف کی زبانی سننے کا حال ہُوا۔ رہا کتاب کا پڑھنا۔ تو وہ بہت آسان
ہے۔ کیونکہ کتاب کی قیمت پڑھنے کی مصیبت سے سبکدوش کر دیتی ہے ؎

بعض احباب انگریزی دان ہیں۔ اُن کے دربار میں فرشتوں کے
بھی پَر جلتے ہیں۔ اُن صاحبوں کے نزدیک اُردو کتاب پڑھنے میں اگر
ذلّت نہیں ہے۔ تو نعمت میں تو ہرگز کلام نہیں۔ اس کے علاوہ ان عزیزوں
کو وقت کی قلّت روپیہ کی کمی سے بھی زیادہ خوار رکھتی ہے۔ گھڑیاں سب
کے پاس ہوتی ہیں۔ مگر وقت کسی کے پاس نہیں نکلتا۔ بالخصوص حالتِ
بیکاری میں۔ ایسے دوستوں سے متوقع ہونا کہ وہ کسی اُردو کتاب کو
پڑھیں گے اوّل درجہ کی گستاخی ہے۔ انگریزی زبان کا علم جس قدر ہے وہ
کافی ہے۔ باقی رہا یہ امر کہ اُردو زبان کوئی چیز نہیں۔ میں اس بحث کو

زیادہ طول نہیں دے سکتا۔ کیونکہ میرے پاس بھی وقت بہت کم ہے ؎

بعض دوست مگر معدودے چند وہ ہیں۔ جن کو ہر قسم کے لٹریچر میں
ایک لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ سخن شناسی کو طبیعت کا جوہر سمجھتے ہیں۔ اور اگر
کمی ہوتی ہے تو اس کو سیکھ کر ہر قسم کی تحریر پرکھنے کا مادہ پیدا کر لیتے ہیں۔
لیکن ان میں یہ وصف ہوتا ہے۔ کہ جہاں کسی کے مُنہ سے کوئی اچھی بات
سُنی۔ یا کسی کتاب میں اچھا فقرہ دیکھا۔ پھر اس خیال میں کہ ہم اس سے
بہتر کہہ سکتے ہیں۔ ایسے محو ہو جاتے ہیں۔ کہ پہروں اُن کی طبیعت غیر حاضر
رہتی ہے۔ اور سُننا یا پڑھنا بالائے طاق ہو جاتا ہے ؎

غرض مجھ کو ان تمام دوستوں میں سے کسی سے بھی توقع نہیں۔ کہ وہ اس
قصہ کو پڑھیں گے۔ اور نہ ان کے پڑھنے سے کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔
اگر کسی کا سننے کو جی نہ چاہے تو کیوں سنے ؎

لیکن اگر مفت نذر ہونے کے بعد اتفاق سے اس قصہ کو پڑھنے کی
نوبت آئے۔ تو میرے اعتبار پر اتنا یقین فرما لیں۔ کہ یہ ترجمہ نہیں ہے
اگر ترجمہ یا تصنیف کے بیچ میں یا اس کی حد سے باہر کوئی چیز تصنیف
سے بھی زیادہ خونِ جگر کی پینے والی ہو۔ تو وہ یہ تحریر ہے۔ رڈیرڈ
کپلنگ صاحب کی مشہور کتاب جنگل بک کی یہ پہلی کہانی ہے۔ قصّے
کے اکثر حصّوں کو بار بار پڑھ کر ذہن میں لایا ہوں۔ اور اصل کتاب بند

کر کے طرزِ تقریر اور اندازِ بیان میں اردو زبان کی رعنائیں کر کے مطالب کو لکھا ہے۔ اگر اس کو بھی آپ اَور ترجموں میں شامل کریں تو خیر۔ وائے برحالِ من ٭

اِس قصّے سے نہ کوئی اخلاقی نتیجہ نکلتا ہے۔ نہ کسی قسم کی صحیح معلومات پیدا ہوتی ہے محض لڑکوں کے ہنسانے اور ان کا ذکر تیز کرنے اور تصوّر کو بڑھانے کے لئے جانوروں کی کہانی نئے پیرایہ میں لکھی گئی ہے ٭

ع - ا

۱۰- ستمبر ۱۹۰۱ء

دیباچہ جنگل کی دوسری کہانی

خلافِ توقع اکثر دوستوں نے جنگل کی پہلی کہانی کو پڑھا اور بہت پسند کیا۔ چند بزرگوں نے بھی جن کی زباندانی کی عظمت مترجم تو کیا چیز ہے بڑے بڑوں کے دل سے نہیں مٹ سکتی قصّے کو پڑھکر طرزِ بیان اور عبارت کی بے اختیار تعریف کی۔ بعض دوستوں کے ذہین اور پیارے بچّے زلفی کی باتوں پر ایسے فریفتہ ہوئے۔ کہ آگے کی کہانیاں سننے کا شوق ظاہر کرنے لگے۔ لڑکیوں نے بھی اس کو پڑھا۔ ہنسیں اور خوش ہوئیں۔ اور اس کی شکایت کی۔ کہ کہانی ادھوری کیوں چھوڑ دی۔ غرض کچھ تو بعض بزرگوں اور دوستوں کی فرمائش سے اور کچھ اس شرا شرمی میں کہ مُنہ مانگی نہ سہی واجبی داد مل چکی ہے۔ اور سب سے زیادہ ترجمہ کرنے کے خبط

Taj Tahir Foundation

نے مجبور کیا۔ کہ جہاں ایک کہانی لکھی ہے۔ وہاں دُوسری بھی سہی ؂

پہلی کہانی کا لُطف تو شاید اس کہانی میں نہ آئے۔ کیونکہ ترجمہ کی دقّتوں نے اس تحریر کے رنگ کو پہلی تحریر سے کسی قدر مختلف کر دیا ہے اکثر جگہ بندروں کا ذکر ہے۔ اور یہ مضمون وہ ہے۔ جس کے لئے مصنّف ہی کی زبان کچھ مناسب وضع ہوئی ہے۔ مترجم کی زبان میں وہ تلوّن وُہ تغیّر وہ بے قراری اور اضطراب کہاں ؟ محض صوتِ الفاظ اور فقرہ کی چُست بندش سے کانوں میں شور اور آنکھوں میں جست وخیز کی تصویر پھر جانی بلکہ خود دھینگا مشتی پر طبیعت کا آمادہ ہو جانا کچھ انگریزی زبان ہی کا حق ہے اُردو غریب میں اتنی جان نہیں۔ بالخصوص ایسی حالت میں کہ اپنا تعلّق خدا کی اس مخلوق سے برائے نام رہ گیا ہو۔ حیوانِ ناطق ومطلق میں تمیز تو انسان ہر وقت کر سکتا ہے۔ لیکن ایسی حالت بھی ہوتی ہے۔ کہ تمیز کرنے کو جی نہیں اُٹھتا۔ آگے چل کر شاید اس سے بھی بڑھکر کوئی درجہ آتا ہو۔ بہرکیف بندروں کا ذکر پڑھ کر ناظرین کے دل پر اگر کچھ اثر ہو۔ تو انہیں مسٹر کپلنگ کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ مترجم سے کوئی شکایت نہ پیدا ہونی چاہیئے۔ اُور جانوروں کا حال بھی مصنّف نے کچھ ایسا دل میں دل ڈال کر لکھا ہے کہ اگر ان جانوروں میں بھی مصنّف ہُوا کرتے۔ تو وہ بھی اس سے بہتر اپنا حال نہ لکھ سکتے ؂

پہلی کہانی میں محاورات وغیرہ کی کچھ غلطیاں انگریزی خواں ہونے کی بدولت رہ گئی تھیں۔ چنانچہ مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے جو مترجم کے حال پر غایت درجہ بزرگانہ لُطف وکرم رکھتے ہیں۔ پہلی کہانی کو دیکھ کر فرمایا تھا۔ کہ اگر دوسری کہانی کا ترجمہ کرو۔ تو مسوّدہ ہمارے پاس بھیج دینا۔ مترجم نے اس حُکم کی تعمیل کی۔ اور اب اس کو فخر ہے۔ کہ اس کہانی کے مسودہ کو ایسے زباندان نے درست کر دیا ہے۔ جس کو اُردو نظم ونثر سے اس وقت ملک کے لاکھوں نونہال اپنی مادری زبان سیکھ رہے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ کی اس تکلیف کا مترجم ہمیشہ شکر گُذار رہے گا ؂

مولوی صاحب کے فرزندِ اکبر محمد محمود صاحب کا شکریہ لکھنا بھی مترجم کا پہلا فرض ہے۔ کہ اُنہوں نے باوجود طرح طرح کی پریشانی اور کثرتِ کار کے مسودہ کے چھپوانے کا کل اہتمام اپنے ذمے لیا۔ اور ہم مکتب ہونے کا پورا حق ادا کیا ؂

ع - ا

جون پور

۱۲- جون سنہ ۱۹۰۲ء

Taj Tahir Foundation

جنگل کی پہلی کہانی

سیونی کا جنگل

سیونی کی پہاڑیاں چاروں طرف سنسان کھڑی تھیں۔ دِن بھر بڑے زور کی گرمی پڑی تھی۔ سُورج ڈوب کر اندھیرا ہونے کو تھا۔ کہ ایک بھیڑیا اپنے بھٹ میں دن بھر کی نیند لے کر چونکا۔ سر اُٹھاتے ہی دو چار جگہ سے پوستین کو چاٹا۔ دانتوں سے دُم کُھجائی۔ پھر اُٹھ کر ایک لمبی چوڑی انگڑائی لی۔ اور ایک پاؤں بڑھا کر پنجے چٹخائے۔ تاکہ ناخنوں سے نیند کا خمار دُور ہو۔ پاس ہی ایک لمبے چوڑے سے پتھر پر گھر والی کُچھ جاگتی۔ چار موٹے تازے ننھے بچّوں کو کلیجے سے لگائے ایک طرف تھتنی دوسری طرف دم کمان کی صورت پڑی تھیں۔ بچّے خوب کِلل بِلل کر رہے تھے۔ قُوں قُوں کر کے ایک پر ایک گدا گد

گرتا تھا۔ اور دو چار لڑکنیاں کھا کر پھر ماں کے سینے سے چاچمٹتا تھا۔
جنگل میں اندھیرا بڑھتا جاتا تھا۔ کہ اتنے میں چاند کی روشنی
تیز ہوئی۔ اور بھٹ میں بھی کہ جہاں یہ سارا کنبہ رہتا تھا اُجالا
ہوگیا۔ بھیڑیا ہوشیار تو ہو ہی چکا تھا۔ چاندنی دیکھتے ہی غرّایا۔ اور
زور سے چھینک کر بولا "اُٹھ یار بن باسی۔ شکار کا وقت آن پہنچا۔
روزی کی فکر کر" یہ کہہ کر چاہتا تھا۔ کہ بھٹ سے نکل کر پہاڑ کے
نیچے اُترے۔ کہ گھر کی دہلیز پر جھاڑو کی سی پرچھائیں دکھائی دی۔
اور سفید سفید دانت اندھیرے میں پورے نظر نہ آئے تھے۔ کہ
آواز آئی "عُمر دولت زیادہ۔ فرزند جئیں۔ دانتوں میں تیزی پنجوں
میں قوت۔ رات دن شکار ماریں کہ ہم بھوکوں کا بھی ساجھا رہے"
یہ جھٹ پٹے کے بھکاری میاں گیدڑ تھے۔ چونکہ فضلہ نوشی
آپ کا شیوہ تھا۔ اِس لئے سارے جنگل میں طباقی کے نام سے مشہور
ہوگئے تھے۔ ویسے بھی رکابی مذہب رکھتے تھے۔ اِدھر کی بات
اُدھر لگا کر فساد ڈلوا دینا ان کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ رات
دِن چغلیاں کھانے کے علاوہ گاؤں گاؤں چکر لگاتے تھے۔ اور
کوڑیوں پر جو کچھ ملتا تھا بے تکلف نوش کر جاتے تھے۔ بھوک کے
ایسے سچے تھے۔ کہ گوشت پوست تو درکنار پھٹے پُرانے چیتھڑے

تک نوچ نوچ کر پیٹ بھر لیتے تھے۔ سُوکھے چمڑے اور پُرانی
جُوتیوں کا تو کیا ذکر ہے۔ غرض اِسی کھانے پینے کی بے احتیاطی
نے اُن کو بھیڑیوں کی قوم میں جو ذات کے اُونچے اور
گھرانے کے سب میں بڑے ہیں۔ سخت ذلیل و خوار کر
دِیا تھا۔ اور پھر اس خوش اخلاقی پر ایک طُرّہ یہ اَور تھا کہ
کبھی کبھی پاگل ہو جاتے تھے۔ اور خدا وُہ دِن نہ دِکھائے۔ کہ
میاں طباقی کا دل اُلٹے۔ سارا جنگل نمونۂ محشر ہو جاتا ہے۔ پھر ان کو
کس کا لحاظ۔ کس کی شرم۔ دُم سیدھی کئے جنگل میں دوڑے پھرتے
ہیں۔ اور جو ملتا ہے اس کو کاٹ کھاتے ہیں۔ اور جو اپنا درجہ ہوتا
ہے۔ وہ ہی دُوسرے کا درجہ کرتے ہیں۔ اس لئے جنگل والوں کو
ان سے نفرت ہی نہیں ہے بلکہ جان کا بھی خوف رہتا ہے۔ کہ خُدا
جانے کس وقت پاگل ہو جائیں۔ بھیڑئیے شیر تک کا یہ حال ہے۔ کہ
جہاں ان حضرت کی وارفتگی کا حال سُنا۔ اور ڈر کے مارے کہیں
دبک کر بیٹھ رہے۔ سچ یہ ہے۔ کہ بن باسیوں میں دیوانگی سے
بڑھ کر کوئی عیب نہیں۔ اور یہ عیب اگر ہے۔ تو میاں طباقی میں سب
سے سوا ہے۔ ان ہی سے شروع ہے۔ اور ختم خُدا جانے کس کس
پر ہوتا ہے ۝

بھیڑیا گیدڑ کی دُعائیں سُن کر ٹھٹک گیا۔ اور بے لُطف ہو کر بولا "میاں طباقی تم آتے بھی ہو۔ تو ایسا وقت نکال کر آتے ہو۔ کہ کھانے کے نام بُھورا تک نہ بچے۔ بھلا اس وقت کیا رکھا ہے۔ تُمہیں یقین کیونکر آئے۔ اندر آ کر خود دیکھ لو"۔

یہ سُن کر طباقی پھر دُعائیں دینے لگے اور بولے "حضور جو کُچھ فرمائیں بجا ہے۔ اس وقت سرکار کے لائق خاصہ میں کُچھ نہ ہوگا۔ مگر ہم بھوکے فاقہ کشوں کو تو چچوڑی ہڈیاں بھی تازے شکار سے بڑھ کر ہیں۔ کمین ذات کو اس سے کیا۔ کہ سامنے کیا آیا۔ جو مل گیا۔ پیٹ بھرنے سے کام"۔ یہ کہہ کر میاں گیدڑ بھٹ میں داخل ہوئے۔ دور کونے میں رات کی بچی کُھچی ہرن کی ران پڑی تھی۔ گوشت برائے نام تھا۔ نری ہڈّی ہی ہڈی باقی تھی۔ پیٹ میں آگ تو لگ ہی رہی تھی۔ بہت خوشی ہوئی۔ دبے پاؤں آگے بڑھے۔ اور دوزانو بیٹھ اگلے پنجوں میں ہڈی پکڑ مزے لے لے کر چچوڑنے لگے۔

جب ہڈّی کو چاٹ چُوٹ چُھکتی بنا دیا۔ تو دو چار چٹخارے بھر کر بھیڑئیے کی بیوی سے کہنے لگے "مائی صاحب۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔ اس وقت بڑا سہارا ہو گیا۔ خدا جانے کتنے در مانگنا پڑتا۔ اوہو یہ تو میں نے دیکھا ہی نہ تھا۔ ماشاء اللہ ایک چھوڑ

چار چار ہیں۔ اور پھر کیسے موٹے تازے نرم نرم ہیں۔ (بچّوں کو دیکھتے ہی میاں طباقی کے مُنہ میں پانی بھر آیا) اللہ عُمر دے۔ ابھی تو دُودھ پیتی جانیں ہیں۔ جب کُچلیاں نکل آئیں گی۔ ہاتھ پاؤں میں جان آجائے گی۔ تو ان کی بہار دیکھئے گا۔ گبرو جوان ہو کر جاڑے گرمی پچھلے پہرے جب روند میں نکلا کریں گے۔ تو شیر تک کے ٹکڑے اُڑا دیں گے۔ چہرے تو ملاحظہ ہوں۔ کیسے اصیل ہیں۔ آنکھوں کی چمک۔ عف میری نظر"۔

گیدڑ یہ تو جانتا ہی تھا۔ کہ بچّوں کے مُنہ پر بچوں کی تعریف اچھی نہیں۔ دوسرے ماں باپ کو نظر گُذر کا بھی ڈر رہتا ہے۔ مگر خصلت کو کیا کرتا۔ جب دیکھا۔ کہ میاں بیوی کو یہ تعریف ناگوار گُذری۔ تو دل ہی دل میں خوش ہوا۔ کُچھ دیر دُم سمیٹے پنجوں پر سر جُھکائے خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ کہ کوئی تازی خبر سُنا کر نیا شگوفہ کھلائیے۔ کہ اتنے میں کُچھ یاد آیا۔ اور بھیڑئیے سے مخاطب ہو کر بولا "آپ نے تو شاید نہ سُنا ہو گا۔ شیر خاں صاحب نے فی الحال اپنی شکارگاہ تبدیل کر دی ہے۔ کل شب کو خدمت میں حاضر ہوا۔ تو فرمانے لگے۔ کہ اس چاند چاند صرف سیونی کی پہاڑیوں میں شکار کھیلا جائے گا"۔

Taj Tahir Foundation

شیر خاں نام کو تو خیر شیر تھے۔ مگر اصل میں ایک لنگڑے بد طینت بد خصلت جانور تھے۔ جو یہاں سے دس کوس کے فاصلے پر بان گنگا کے کنارے ایک سوکھے نالے میں رہا کرتے تھے۔ پیدائشی لنگ رکھنے کی وجہ سے اکثر تین ٹانگوں پر چلتے تھے۔ اس لئے جنگل میں بالعموم وہ حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

یہ خبر سنتے ہی بھیڑیا ناخوش ہوکر بولا۔ "یہ تو فرمائیے۔ کہ آپ کے آقائے نامدار کو جن کے آپ خانہ زاد ہیں۔ کہیں آپ کی طرح کوئی سودا تو نہیں اُٹھا ہے؟ بھلا یہ تو فرمائیں۔ کہ جنگل کا وہ کون سا قانون اور ضابطہ ہے۔ کہ بغیر اطلاع کے کوئی درندہ اپنے شکار کی جگہ تبدیل کر سکے۔ یہاں تشریف لائے۔ تو سوائے اس کے کیا ہوگا۔ کہ کوسوں تک شکار ہوشیار ہو جائے گا۔ اور مصیبت ہم پر آئے گی جن کو فقط اپنا ہی پیٹ پالنا نہیں ہے۔ بلکہ بیوی بچوں کا بھی ساتھ رکھتے ہیں"۔

بھیڑیئے کی بات پوری ختم نہ ہوئی تھی۔ کہ گھر والی پڑے ہی پڑے جل کر خاک ہو گئیں"۔ اے ہے سچ ہے۔ اس موئے شیر خاں کی ماں اس کو لنگڑا لنگڑا یوں ہی نہیں کہا کرتی تھی۔ یہ موا تو جنم کا

بیلی ہے۔ شکار کو کیا جانے۔ کس چڑیا کا نام ہے۔ اُدھ موئی گائے بھینسوں کے سوا ہم نے تو نہیں سنا۔ کہ اس بے ایمان کو کچھ ہاتھ بھی لگا ہو۔ اور اب موا بے غیرت اس جوگا بھی نہیں رہا ہوگا۔ گاؤں کے اہیر پیچھے پڑے ہونگے۔ جو یہاں جان بچانے آیا ہے۔ خود تو فاقے مر چکا۔ اور اب ہم کو بھوکا مارے گا۔ اور جو یہاں بھی دشمنوں نے کھوج لگا کر ہانکا ڈال دیا۔ اور اس گھر سوکھی سا کی گھاس میں آگ لگا دی۔ تو یہ موذی دفع دفان ہو جائے گا۔ ہم ان بچوں کو لے کر کہاں غارت ہوں گے۔ اے ہے۔ اس جوانا مرگ شیر خاں نے اس کا ستیاناس جائے۔ ہمارے ساتھ تو جب کیا ایسا ہی سلوک کیا۔ اس نمک حرام گیدڑ کو تو دیکھو۔ اسے موت لے جائے۔ ہمیں خبریں سنانے آیا ہے۔ شیر خاں کے سامنے کچھ منہ سے نہ پھوٹا۔ آخر ہمارا نمک بھی تو کھایا تھا"۔

میاں طباقی یہ تیز باتیں سنتے ہی دُم دبا کر بھاگنے کو تیار ہو گئے۔ مگر سوچے کہ کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ فرمانے لگے۔ "پھر اگر ارشاد ہو۔ تو اس سلوک کا حال شیر خاں صاحب کی خدمت میں گذارش کردوں"؟

بھیڑیا گیدڑ کی فطرت کو تاڑ گیا۔ اور ایک دفعہ ہی بھبک کر

Taj Tahir Foundation

بولا "دور ہو موذی۔ جس کا غلام ہے اسی کی خوشامد کر۔ آج کے شکار کا تو ناس کھو دیا۔ اور کیا چاہتا ہے"۔

اتنا سنتے ہی میاں طباقی ایک چھلانگ میں بھٹ سے باہر آئے۔ اور یہ کہتے ہوئے نوک دُم بھاگے۔ "بہت خوب۔ بہت خوب۔ بندہ رخصت۔ خود ہی سن لیجئے۔ وہ ندی کے کنارے جھاڑیوں میں شیر خاں آپہنچے"۔

بھیڑیئے نے جھٹ دونوں کان اونچے کر لئے۔ اور غور سے سننا شروع کیا۔ پہاڑ کے نیچے جہاں گھاٹی میں ندی بہتی تھی غرانے کی آواز آئی۔ آواز میں ایسی گرج تھی۔ جس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ حالت بہت غیظ و غضب کی ہے۔ اور اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ کوئی سنتا ہے یا نہیں۔ بھیڑیا اتنا سنتے ہی گھر والی سے کہنے لگا۔ "سنتی ہو اس احمق کو۔ شروع رات کا تو شکار ہے۔ اور آواز میں کس بلا کی تیزی ہے۔ بے وقوف سمجھتا ہے۔ کہ ہمارے جنگل کے ہرن اور پاڑے بھی بان گنگا کی مریل گائیں ہیں۔ آنکھوں کی اندھی اور کانوں کی بہری۔ جن کو سوائے چرنے کے کسی بات کا ہوش نہیں"۔

بھیڑیئے کی بیوی بولی "واہ آپ بھی خوب سمجھے کس کا ہرن

اور کس کا پاڑا۔ یہ آدمی کا شکار ہو رہا ہے۔ ذرا غور سے سنو"۔ بھیڑیئے کی جورو یہ کہتی ہی تھی۔ کہ آواز کی کیفیت بدل گئی۔ اور اس کی گونج ایسی تیز تھی۔ کہ سارے جنگل میں سما گئی۔ یہ وہ قیامت کی آواز ہے۔ جو بیسیوں کو موت کا لقمہ بنا دیتی ہے۔ بھولے بھٹکے مسافر۔ غریب لکڑہارے اور بنجارے جن کی منزل شام سے پہلے ختم نہیں ہوتی۔ تھک کر جنگل ہی میں پڑ رہتے ہیں۔ یہ آواز اُن کو گہری نیند سے جگا کر بدحواس کر دیتی ہے۔ اور وہ اکثر جان بچانے کے لئے اسی طرف جا گھستے ہیں۔ جدھر اس موت کا سامنا ہوتا ہے۔

بھیڑیا بیوی کی بات سن کر بہت تاؤ اور غصہ سے بولا۔ "استغفر اللہ۔ کیا گنگا کے کنارے کیڑے مکوڑے مر گئے۔ مینڈک سڑی مچھلیاں پیٹ کو نہیں ملتیں۔ کہ اب اس بدبخت نے گوجروں کو مار مار کر کھانا شروع کیا ہے۔ وہ بھی ہمارے جنگل میں"۔

بھیڑیئے کا یہ خیال کچھ بیجا نہ تھا۔ کیونکہ انسان کی طرح جنگل میں رہنے والوں میں بھی ایک قانون جاری تھا۔ یہ قانون بن پوتھی کے نام سے مشہور تھا اور تمام درندے چرند و پرند اس کے پابند تھے۔ اس کا دریافت کرنا تو ذرا مشکل ہے۔ کہ یہ قانون کی کتاب کن وقتوں سے جاری تھی۔ مگر یہ سب جانتے تھے۔ کہ اس میں

کوئی بات بغیر دلیل اور ثبوت کے بیان نہیں کی گئی ہے۔ مختصر یہ کہ بن کی پوتھی میں بار بار حکم دیا گیا تھا۔ کہ کوئی درندہ انسان کو قتل نہ کرے۔ صرف ایک صورت مستثنیٰ بیان ہوئی تھی۔ اور وہ یہ تھی۔ کہ جب کوئی ماں یا باپ اپنے بچوں کو شکار کا کرتب سکھاتا ہو اور محض تعلیم کی غرض سے مثلاً انسان کو شکار کر ڈالے تو مضائقہ نہیں۔ مگر اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ کہ اس قسم کا شکار ہرگز ان حدود کے اندر واقع نہ ہو۔ جو اپنے غول کے شکار کے لئے مخصوص کی گئی تھیں + گو یہ قانون بہت سخت تھا۔ اور اکثر درندوں کو اس کا متحمل ہونا شاق گذرتا تھا۔ مگر پھر بھی سختی سے اس کی پابندی کی جاتی تھی۔ اس کے کئی سبب تھے۔ جن کو جنگل کے مہا پنڈت بھالو جی بھورے نے بڑی صراحت سے بیان کیا ہے؀

پہلا سبب یہ تھا۔ کہ جہاں کسی انسان کا قتل مشہور ہوا۔ فوراً دو ٹانگ کے کالے پیلے جانور ہاتھیوں پر چڑھ بندوقیں لے جنگل میں گھس پڑتے تھے۔ اور سارے جنگل کو چھان مارتے تھے۔ جس سے بن کے تمام جانوروں کو سخت اذیت پہنچتی تھی + دوسرا سبب بھالو جی نے یہ تحریر کیا ہے کہ خدا کی مخلوق میں سب سے زیادہ کمزور اور محتاج انسان ہے۔ اس لئے شان صیادی

کے خلاف ہے۔ کہ ایسے بودے حیوان کا شکار کیا جائے + تیسرا سبب جو سب سے قوی تھا یہ تھا۔ کہ جہاں کسی درندے نے آدم خوری شروع کی۔ اور سوداوی خلط کو ترقی ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ کچلیاں جلد ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور پوستین کے بال کم ہوتے ہوتے بالکل خارشتی ہو جاتا ہے ؀

آدمی کا بچہ

غرّانے کی آواز تیز ہوتے ہوتے ایک دفعہ ہی اڑاڑاڑادو کر کے شیر دہاڑا۔ اور دہاڑ کے ساتھ ہی کسی چیز کے گرنے کا دھماکا ہوا۔ بھیڑیئے کی جورو گھبرا کر بولی "معلوم ہوتا ہے شکار چھٹ گیا۔ دیکھو تو کیا چیز تھی"؀

بھیڑیا دو چار قدم آگے بڑھا تو کیا دیکھتا ہے کہ شیر غصے اور تکلیف سے بیتاب ہو کر چیختا ہے۔ اور ایک پنجہ زمین پر دے دے مارتا ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر بھیڑیا گھر والی سے بولا "یہ تماشہ بھی دیکھتی ہو۔ احمق کو اور کچھ بن نہ پڑا۔ تو لکڑہاروں کے الاؤ پر جا کودا۔ اور اگلا پنجہ جلا لیا۔ طباقی ساتھ ہیں۔ کیوں نہ ہو۔ وزیرے چنیں شہریارے چناں"؀

Taj Tahir Foundation

بھیڑیا اتنا کہنے نہ پایا تھا۔ کہ بیوی نے دبی آواز سے کہا۔
"دیکھنا، ہوشیار ہو جاؤ۔ کوئی چیز بھٹ کی طرف آتی ہے"۔
یہ کہتے ہی گھاس میں کچھ آہٹ ہوئی۔ اور بھیڑیا جھٹ دبکی لگا ہو بیٹھا۔ اب جو کچھ ہوا وہ دیکھنے اور حیرت کرنے کے قابل تھا۔ بھیڑیئے نے پاس آتا دیکھ کر اس پر جست کی۔ مگر جست پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ بیچ میں ہی رکنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ زمین سے سیدھا چار ہاتھ اڑ کر دفعتہً پلٹا۔ اور یہاں سے اچھلا تھا۔ پھر وہیں دھم سے آن گرا۔ اور گرتے ہی جھنجلا کر بولا "جا کم بخت تیرا برا ہو۔ تو اس وقت کہاں"۔ بات یہ ہوئی تھی۔ کہ بھیڑیئے نے جس چیز پر شکار سمجھ کر جست کی تھی۔ وہ آدمی کا بچہ نکلا۔ جس کو ابھی پورا پاؤں پاؤں چلنا بھی نہ آیا تھا۔ کالا کلوٹا ننگا دھڑنگا۔ انگوٹھے چوستا گرتا پڑتا جھونکے کھاتا چلا آتا تھا۔ جوں ہی بھیڑیئے سے چار آنکھیں ہوئیں۔ کلکاریاں مار کر ہنسنے لگا۔

گھر والی بچے کو دیکھتے ہی کہنے لگی "اے ہے کیا آدمی کا پلا ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس کو ذرا یہاں اٹھا لاؤ۔ میں نے آدمی کا بچہ غور سے نہیں دیکھا"۔

بھیڑیئے نے بچے کو منہ میں پکڑ کر اس طرح اٹھایا۔ کہ اس

کی نازک جلد پر دانتوں کا نشان تک نہ ہوا۔ اور بھٹ کے اندر لا کر اپنے بچوں میں ڈال دیا۔ جو اتنے میں ماں کو چمٹ کر دودھ پینے لگے تھے۔ گو آدمی کا بچہ تھا۔ پر بھیڑیئے کی بیوی مامتا ماری تھی۔ ترس کھا کر کہنے لگی "اے ہے نگوڑا ذرا سی جان۔ بالکل ننگا بوٹی ہے۔ جاڑے پالے میں کیونکر جیتا ہوگا۔ دیکھنا ہُوا اڈر کیسا ہے"۔ ادھر یہ باتیں ہوتی تھیں۔ ادھر بچے نے فرصت پائی۔ ایک بچے کی دُم پکڑ اُس کو اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ ہلا ٹیاؤں ٹیاؤں کر کے چکر کھانے لگا۔ اور یہ جھٹ گرماتی پا اس کی میّا کے کلیجے سے چمٹ چُسر چُسر دودھ پینے لگا۔ بچوں کی ماں یہ کیفیت دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اور مسکرا کر میاں سے کہنے لگی "یہ حرکت بھی دیکھی تم نے؟ خدا جانے کس وقت کا بھوکا ہے۔ دیکھنا میں کہتی ہوں اب کے دودھ کی تو کچھ کمی نہیں۔ مفت میں پل جائیگا۔ اور کچھ نہیں۔ برادری میں نام تو ہوگا۔ کہ ایسی عجوبہ چیز کسی کے ہاں نہیں۔ کہاں بھیڑیا کہاں آدمی!"

بھیڑیا بولا "نہیں یہ بات تو نہیں ہے۔ بھیڑیئے کے بھٹ میں آدم زاد کے پلنے کا ذکر تو اکثر سنا ہے۔ مگر اپنے خواب میں اتنی عمر ہونے کو آئی۔ یہ بات نہ کبھی دیکھی۔ اور نہ کبھی سنی۔ تم کو اس بچ

Taj Tahir Foundation

بہت ترس آیا۔ میں تو ایک ہی پنجے میں کام تمام کر دیتا۔ جلد تو دیکھو کیسی نازک ہے۔ مگر آدمی کا گوشت مجھ کو کیا کسی بھیڑئیے کو بھی نہیں پچتا۔ دُوسرے یہ مجھ سے ڈرا نہیں۔ دیکھو تو ایک ایک کو دیکھ کر ہنستا اور ہمکتا ہے۔"

بھٹ میں یا تو چاندنی کھلی تھی یا گھپ اندھیرا ہو گیا۔ اور دروازے میں جہاں سے روشنی آتی تھی۔ شیر خاں نے اپنا چوکھونٹا جھاڑ جھنکاڑ مُنہ اور اگلے دونوں پنجے ڈال دئے۔ مگر شانے غار کے مُنہ میں پھنس گئے۔ طباقی دُم کے ساتھ لگے آواز لگاتے تھے۔ "جی ہاں حضور۔ جی ہاں حضور شکار اسی بھٹ میں گیا ہے۔"

بھیڑیا یہ نقشہ دیکھتے ہی ہوشیار ہوا۔ اور استعجاباً دونوں کان کھڑے کر شیر سے کہنے لگا۔ "آپ نے بڑا کرم کیا جو یہاں تک تکلیف فرمائی۔ مگر وہ ایسی کون سی ضرورت تھی۔ جو اس زحمت کا باعث ہوئی؟"

شیر خاں بہت ہی کچھ مُنہ پھلا کر غرائے "باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ سیدھی طرح بتاؤ ہمارا شکار کہاں ہے۔ ایک آدمی کا بچہ اس رستے آیا ہے۔ اس کے ماں باپ بھاگ گئے ہیں۔

Foundation

اور وہ بھٹک گیا ہے۔ مگر وہ ہمارا شکار ہے فوراً حاضر کرد" ٭

یہ تو آپ بھیڑئیے کی زبانی سُن ہی چکے ہیں۔ کہ شیر خاں لنگڑے بھوک میں بیتاب ہو کر ایک لکڑ ہارے کے دہکتے الاؤ پر جا کُودے تھے۔ اور اگلا پنجہ جلا چُکے تھے۔ اس وقت کچھ تو ہاتھ میں جلن ہو رہی تھی۔ اور کچھ شکار چُھوٹ جانے پر پیچ و تاب کھاتے تھے۔ غرض حالت غیر تھی۔ بھیڑیا سمجھ گیا۔ کہ شیر کی نیت فساد کی ہے۔ مگر اطمینان تھا۔ کہ بھٹ کا مُنہ اتنا چوڑا نہیں ہے۔ کہ شیر خاں گھر کے اندر بازپُرس کے لئے تشریف لے آویں ٭

بھیڑئیے نے شیر کی گفتگو سُن کر صاف صاف کہنا شروع کیا۔ کہ "خاں صاحب یہ تو آپ کو بخوبی معلوم ہے۔ کہ ہم بھیڑیوں کی قوم ایک بالکل بااختیار اور آزاد قوم ہے۔ جو کُچھ حکم احکام ہم پر جاری ہو سکتے ہیں۔ وہ صرف ہماری قوم کے سردار کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ کسی داغی جانور چتکبری کھال والے مُردار خوار کی مجال نہیں ہے۔ کہ ہم کو ہمارے گھر میں آکر حکم سُنائے۔ آدمی کا بچہ ہمارا ہے۔ چاہے ہم اُس کو ماریں۔ چاہے جِلائیں۔ آپ کو اس سے کیا مطلب و غرض ؟"

شیر خاں کو اتنی بات کی تاب کہاں تھی ؟ غصہ سے آنکھیں

لال کر کے بولے "او کُتّے بکتا کیا ہے۔ مُنہ سنبھال۔ بڑا اچاہنے نہ چاہنے والا آیا۔ جانتا بھی ہے۔ ہم سارے جنگل کے بادشاہ ہیں جن کی حکومت کا بٹانے والا آج تک پیدا نہیں ہوا۔ کو سمجھتا کیا ہے۔ سوگند ہے اس موٹے بجار کی جس کو ہم نے ابھی ابھی گنگا کے نالے میں پھاڑا ہے۔ کہ ایک پل میں تیرے سارے کُنبے کو غارت کر دیا جائے گا"! اتنا کہتے ہی شیر خاں غار کے مُنہ پر اس زور سے دہاڑے۔ کہ بھٹ میں خاک اُڑنے لگی۔ اور سارا پہاڑ لرز گیا۔ بھیڑئیے کی جورو یا تو چپ پڑی یہ قصہ سُن رہی تھی۔ یا ایک دفعہ ہی جھرجھری لے بچوں کو دُور جھٹک دُم گردن پھلا لپک کر شیر کی طرف آئی۔ ادھر شیر کے دیدے سُرخ انگارا ہو گئے تھے۔ ادھر بھیڑئیے کی جورو کی آنکھیں بھی سبز لال ٹیٹوں سے کم نہ تھیں۔ غرض جب یہ سُرخ اور سبز روشنیاں قائم ہو گئیں۔ اور غراٹوں کے ساز خوب اُونچے کھچ لئے۔ تو بھیڑئیے کی بیوی نے یہ زہر اُگلا :-

"او مُوذی! تُو شیر ہے۔ تُو ادھر دیکھ مَیں بھی جنگل کی ڈائن ہوں۔ کلیجہ تک چبا جاؤں گی۔ بڑا دانت نکوسے غُرفش کرتا۔ گیدڑ کو حمایتی بنا کر آیا ہے"۔ ہمارا شکار حاضر کرو۔ ہمارا شکار ادھر

آیا ہے"۔ ارے مردے تو کیڑے مکوڑوں کو کھانے والا گائے بھینس چوٹّا! تجھے کبھی شکار نصیب بھی ہوا ہے جنم کے لنگڑے تیرے دیدوں میں خاک۔ یہ آدمی کا بچہ ہمارا ہے۔ تُو مانگنے والا کون ہوتا ہے ؟ مجال ہے اس کا کوئی بال بیکا تو کر لے۔ بوٹیاں اُڑا دوں۔ خون پی جاؤں۔ ہڈیاں تک نہ چھوڑوں۔ مجھ ڈائن کو تُو جانتا نہیں۔ ذرا کان کھول کر سُن لے۔ تھرن کی چھاتی پی کر یہ بچہ جنگل کا شکاری بنے گا۔ ایک دن جنگل چھان مارے گا۔ اور تجھ کو مار گیرتی کمال نہ کھینچی ہو۔ تو میرا نام تھرن نہیں + خیر ہے تو سیدھا پلا جا۔ نہیں تو تیا غریب بیٹھ کر روئے گی۔ کہ یہ بچو! آ تین ٹانگ سے دو ہی ٹانگ کے رہ گئے۔ دُور ہو مُوئے مُردے خور۔ جنگل کے جلے جانور۔ لنگڑے بیری!"

یہ تقریر سُن کر بھیڑئیے کے بھی اوسان خطا ہوئے۔ اور وُہ وقت آنکھوں میں پھر گیا۔ جب کہ شباب کا عالم تھا۔ اور بندھیا چل کے پہاڑوں میں ان بلائے بے درماں سے پہلی مٹھ بھیڑ ہوئی تھی۔ جب بھی تھرن ہی کے نام سے یہ مشہور تھیں۔ دس پانچ دُکھنی بھیڑئیے جن کی ہیبت سے سارا جنگل تھراتا تھا۔ ان کے ساتھ جلوس میں رہتے تھے۔ بڑی بڑی خوں ریزیوں کے بعد

Taj Tahir Foundation

یہ نوبت آئی۔ کہ زُمرۂ احباب میں شامل ہو کر ان سے بیاہ کی ٹھیر جائے ؛

شیر خاں کا حال یہ تھا۔ کہ بھیڑیئے کا یعنی شوہر کا مقابلہ تو وُہ آسانی سے کر لیتے۔ لیکن قہرن سے ان کی رُوح بھی فنا ہوتی تھی۔ اوّل تو بھٹ ایسا تنگ و تاریک تھا۔ کہ وہاں لڑنا سخت دُشوار تھا۔ دوسری مشکل یہ تھی۔ کہ زچہ خانے میں لڑ کر جی کھو دینا بی قہرن کے نزدیک کوئی بات نہ تھی۔ غرض شیر نے لڑنا مناسب نہ سمجھا۔ اور غار کے مُنہ سے اُلٹے پاؤں غرّاتا ہُوا باہر آیا۔ اور دو قدم ہٹ کر کہنے لگا :۔

"بھونکے جا کُتیا تیرے ساتھ کون بھونکے۔ دیکھ تو سہی کیسا بتاتا ہُوں۔ بڑی چودھرائن بن کر بیٹھی ہے۔ جنگل کے اَور بچ بھی تو ابھی جیتے ہیں۔ وہ بتائیں گے آدم زاد کا پالنا کیسا ہوتا ہے۔ یاد رکھو۔ یہ بچّہ ایک دن ہماری ڈاڑھ گرم کرے گا۔ ٹھیر جا۔ دُم دار چوٹی۔ کل جبّی ڈائن اس بد زبانی کا مزہ ایک دن خوب چکھاؤں گا" ؛

یہ کہہ کر شیر خاں اپنے رستے چلے گئے۔ طباقی بھی دل میں شرمندہ دُم دبائے کان نیچے کئے ہرکارے کی چال روانہ ہوئے۔ چاند کو دیکھ دیکھ کر روتے جاتے تھے۔ اور سوچتے تھے کہ ہائیں

کوئی جوہڑ ملے تو ڈوب مریں۔ مگر بے غیرتوں کو موت کہاں۔ تھوڑی دُور دوڑنے کے بعد سب کچھ بُھول گئے۔ اور آدھی پر ابھی ایک نہ بجا تھا۔ کہ اَور بھائی بندوں کے ساتھ بَن کی چوکیداری کرنے لگے ؛

اب سُنیے۔ کہ جب شیر بھٹ سے چلا گیا۔ تو بی قہرن اپنے بچّوں میں آن پڑیں۔ جنہوں نے رو رو کر سارے بھٹ کو سر پہ اُٹھا لیا تھا۔ آخر عورت ذات تھیں۔ دم قابُو میں نہ رہا۔ ناتوانی سے ہانپنے لگیں۔ اور دیر تک چُپ بیٹھی غصّے کو دھیا کیا کیں ؛

دیر تک میاں بیوی خاموش بیٹھے رہے۔ آخر کو بھیڑیا بولا۔ "ایک بات شیر خاں نے ذرا ٹیڑھی کہی ہے۔ ذرا خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر اِس بچّے کو اپنے ہاں رکھتی ہو۔ تو ایک دن بچوں کے سامنے اسے لے جانا ہوگا۔ یا بالکل جی میں ٹھان لی ہے کہ اس کو پالو گی ؛ ہم تو جانیں کھاپی کر فیصلہ بھی کر دو۔ کیوں بات بڑھائی۔ کسی کو خبر تک نہ ہوگی" ؛

قہرن بگڑ کر بولیں "مجھے یہ بے وقت کی ہنسی بھلی نہیں لگتی۔ آخر تمہارے مُنہ پر بھی تو دیدے ہیں۔ اتنا نہیں سوجھتا۔ کہ یہ نگوڑا ذرا سی جان اوّل تو گرتا پڑتا اپنے آپ ہمارے بھٹ

Taj Tahir Foundation

کم آیا۔ رات گئے آیا۔ بھوکا آیا۔ ننگا آیا۔ کسی سے نہ ڈرا۔ آتے ہی چھاتی پینے لگا۔ پھر پوچھتے ہو۔ پالو گی؟ یہ بات بھی پوچھنے کی ہے۔ آدمی خود تو سوچے۔ پھر یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ تمہارا کیا جائے گا۔ اس موئے لنگڑے قصائی کی طرح تم بھی کھا پی کر گنگا کے کنارے جا سونا۔ اور اس بھٹ کو آگ لگوا دینا۔" اتنا کہہ منہ موڑ بچے کی طرف ہو بیٹھی۔ اور بچے سے پیار کی باتیں کرتے کرتے دم سے تھپک تھپک کر اُس کو سُلا دیا۔

بھیڑیا دل میں بہت نادم ہوا۔ اور بولا "یہ تو سب سچ ہے پر اس کا بھی کچھ فکر ہے۔ کہ برادری والے سُنیں گے تو کیا کہیں گے" تھرن نے میاں کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور بچوں میں مصروف رہی۔ بھیڑیا اس وقت بہت پریشان تھا۔ شکار کا وقت نکل چکا تھا۔ دُوسرے طبیعت یکسو نہ رہی تھی۔ اس حالت میں شکار کو نکلتا بھی تو کیا خاک ملتا۔ پھر یہ قصہ آدمی کے بچے کا ایسا جھگڑا تھا۔ کہ انجام سمجھ میں نہ آتا تھا۔ غرض جب اپنی عقل نے کچھ مدد نہ کی۔ تو ضابطہ جنگلات پر اس طرح غور کرنے لگا۔

جنگل کے قانون میں لکھا ہے۔ کہ شادی کرتے ہی ایک بھیڑیئے کو اختیار رہے۔ کہ غول سے علیحدہ ہو جائے۔ لیکن اگر اس مفارقت

کے زمانے میں اس کے ہاں بچے پیدا ہو جائیں۔ تو پھر اس کا فرض ہوتا ہے۔ کہ ان بچوں کو جس وقت وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوں۔ پنچ پربت پہ حاضر کرے۔ جہاں مہینے کے مہینے چاند کی چودھویں رات کو بھیڑیوں کی پنچایت ہوا کرتی تھی۔ اور برادری کے سب چھوٹے بڑے اس میں شریک ہوا کرتے تھے۔ پنچایت میں بچوں کا بلانا اِس لئے قرار پایا تھا۔ کہ سب بڑے بُوڑھے بھیڑیئے برادری کے بچوں کو شناخت کر لیں۔ اور ان کو خوب پہچان لیں۔ تاکہ آئندہ لاعلمی کی وجہ سے کوئی فعل کسی بھیڑیئے سے اُن قواعد کے خلاف عمل میں نہ آئے۔ جن میں بچوں کی تہذیب و تربیت و حفاظت کے لئے خاص احکام منضبط کئے گئے تھے۔

جس وقت اس قاعدے کے بموجب تمام چھوٹے بڑے پلوں کا معائنہ ختم ہو جاتا تھا۔ تو پھر یہ پلے کچھ دنوں تک بالکل آزاد کر دیئے جاتے تھے۔ کہ جہاں چاہیں اُچھلتے کودتے پھریں جس جھٹ میں چاہیں بے پُوچھے چلے جائیں۔ جس بھیڑیئے کا چاہیں کان پکڑ کر لٹک جائیں۔ یا دُم پکڑ کر گھسیٹ لیں۔ اور جب تک یہ پلے جوان ہو کر اپنا پہلا ہرن خود شکار نہ کر لیں۔ کسی بھیڑیئے کو خواہ بھوکا ہو یا پیٹ بھرا۔ یہ حکم نہ تھا۔ کہ ان پلوں میں سے

Taj Tahir Foundation

کسی کو جان سے مار ڈالے۔ اور اگر کوئی بھیڑیا ایسا کرتا تھا۔ تو فوراً گرفتار کر کے قتل کر دیا جاتا تھا۔ بھالو جی نے اِس سزا کی کوئی خاص وجہ تو نہیں لکھی ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا بھی عقل سے کام لے کر سوچیں گے۔ تو فوراً سمجھ لیں گے۔ کہ یہ قانون کس قدر انصاف پر مبنی تھا۔

پنچایت

ہم یہ بیان کر چکے ہیں۔ کہ بھیڑیئے کے لئے یہ زمانہ سخت تردّد کا تھا۔ اوّل تو بیوی کی آئے دن کی بدمزاجی سے بجائے ناک کے نتھنی میں دم رہنے لگا تھا۔ ایک ایک جھول میں آتنے بچے دیتی تھیں۔ کہ شکار مارتے مارتے ایک طرف کی پسلیاں دُوسری طرف کی پسلیوں سے وصل ہو گئی تھیں۔ پھر مرے پر سَو دُرّے۔ آدمی کا پلاّ اَور پال بیٹھیں۔ ادھر شیر خاں اور طباقی کی طرف سے اندیشہ تھا۔ کہ معلوم نہیں برادری میں کیا جا لگائیں۔ سرِ مجلس آبرو ریزی کے درپے ہو جائیں۔ غرض اس فکر میں دن سو سو کر اور رات شکار کے پیچھے دوڑ دوڑ کر دو تین پنچایتیں ٹالیں۔ اور جب بچے ذرا ہوشیار ہو گئے۔ تو ایک دن شام کو چودھویں رات

کا چاند نکلتے ہی مع اہل و عیال کے بھٹ سے نکلے۔ آگے آگے خود ہوئے۔ بیچ میں بچّوں کو لیا۔ بیوی پلّوں کو گھُرکتی گھُرکاتی کہ کہیں کم بخت بھٹک نہ جائیں پیچھے پیچھے چلیں۔ اور بہ ہزار دشواری پنچایت والے پہاڑ پر صحیح سلامت پہنچیں۔

یہاں پہاڑ کی چٹیل چوٹی پر اُونچے اُونچے چٹانوں کے ٹکڑے بے قرینے پڑے تھے۔ جن کی اوٹ میں اگر خدانخواستہ بُرا وقت آئے۔ تو سینکڑوں بھیڑیئے فوراً چُھپ جائیں۔ ان پتھروں میں جو سب سے اُونچا پتھر تھا۔ وہاں قوم کا سردار ایک بڑا پُرانا گرگ باراں دیدہ جو جنگل کے صدہا طُوفانوں کو جھیل کر دشت و کوہسار کے جملہ نشیب و فراز سے اپنے غول کی رہنمائی میں شہرہ آفاق ہو چکا تھا۔ بڑے ٹھاٹھ سے ہاتھ پاؤں پھیلائے اگلے پنجوں پر ٹھوڑی رکھے لیٹا تھا۔ قوم کے شائستہ لوگوں میں اس کا نام یکتائی مشہور تھا۔ مگر عرفِ عام میں اس کو چودھری کہا جاتا تھا۔ صحرائی زندگی میں آزمودہ کار ہونے کے علاوہ عالم شباب میں کہ عقل کچی ہوتی تھی۔ کئی بار انسان کے دام میں گرفتار ہو چکا تھا۔ لیکن بخت کی یاوری اور عقلِ خداداد کی رسائی نے گردن ہمیشہ سلامت رکھی۔ ایک دفعہ گاؤں والوں کے اتنے لٹھ کھائے۔ کہ بیابانِ مرگ

کی سرحد تک پہنچ گیا۔ اور جنت کی نیل گائیں نظر آنے لگیں۔ قاتلوں نے مُوا سمجھ کر نعش کو بے گور و کفن چیل کوّوں کے سپرد کیا۔ اور بڑے بڑے گِدھ مرگھٹوں سے اُٹھ کر کِریا کرم کے لئے حاضر ہو گئے۔ مگر سخت جان تھا موت نہ آئی۔ جلد توانا و تندرست ہو گیا + غرض ایک مدّت کی سیّاحی اور بادیہ پیمائی نے ساکنانِ صحرا کے حالات ہی سے آگاہ نہ کیا۔ بلکہ انسان کے خصائل و عادات کا تجربہ بھی ہوتا رہا۔ کبھی گردن بچی تو تھُتنی پر زخم آیا۔ اور کبھی ٹانگ سلامت نکل آئی۔ تو دُم کٹ کر رہ گئی + غرض قوم کی رہبری کے لئے اس سے زیادہ لائق اور تجربہ کار بھیڑیے کا ملنا دشوار تھا۔ اور اب ایک برس ہونے کو آیا تھا۔ کہ اس جلیل القدر منصب کی سخت ذمہ داریوں کو نہایت نیک نامی سے انجام دے چُکا تھا +

چٹان کے نیچے جس پر سردار بیٹھا تھا۔ پہاڑ کی ہموار چوٹی پر غول کے جملہ خورد و بزرگ جمع تھے + خاکی رنگ کے جوان بھیڑیوں سے لے کر جن کو بزرگوں کی مجلس میں نچلا بیٹھنا دُشوار تھا۔ اور جو آدابِ محفل کے خلاف اکثر دُم سے پنجے جھاڑتے تھے۔ یا پنجوں سے کان کھُجانے لگتے تھے + بڑے بڑے مُسن آزمودہ کار بھیڑیے سیاہ رنگ گلیم پوشان خونی چشم جو یکّہ و تنہا اپنے سے چوگنے ڈیل

کے بارہ سنگھے کو چشمِ زدن میں خاک کا پیوند بنا دیں حاضر تھے۔ اور ایک حلقے میں ادب سے دو زانو بیٹھے نہایت متانت کے ساتھ ہلکے تنفّس میں ہانپ رہے تھے۔ حاضرین کی تعداد چالیس سے کم اور پچاس سے زیادہ نہ تھی + حلقے کے اندر وہ خاندان جمع تھے جو اپنی اولاد کو قوم کی شناخت اور معائنہ کے لئے لائے تھے۔ اور بیچوں بیچ بی قھرن بچّوں کو سامنے لئے میاں کے پہلو میں کسی قدر چین بجبیں بیٹھی تھیں۔ ہر طرف سکوت کا عالم تھا + بچّے البتہ کشتیاں لڑتے لڑتے چوٹ کھا کر رونے لگتے تھے۔ تو ماں باپ فوراً دو چار گھُرکیاں دے کر اُن کو خاموش کر دیتے تھے + چودھویں رات کا چاند آسمان سے جنگل اور پہاڑوں پر نُور برسا رہا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بُوڑھا بڑا بھیڑیا ضعفِ بصارت سے معذور حلقے سے اُٹھتا۔ اور کسی بچّے کے پاس آ کر اس کو خوب غور سے دیکھ بھال کر پھر اُلٹے پاؤں دبی چال اپنی جگہ جا بیٹھتا + کبھی کبھی کوئی ماں اس خیال سے کہ کہیں برادری والے میرے بچّے کو پہچاننا نہ بھول جائیں۔ بچّے کا کان پکڑ کر کہیں چاندنی میں بٹھا آتی تھی + کبھی کبھی چودھری چٹان پر سے دُم ہلا کر آواز لگاتا تھا۔ "بھیڑیو دیکھ لو۔ بھال لو۔ پہچان لو۔ اپنی نسلوں کو نہ بھولو" اتنا سُنتے ہی بچّے

Taj Tahir Foundation

والیاں بھی یہی آواز لگاتی تھیں۔ اور سارا جنگل گونج اُٹھتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں پھر وہی پہلا سناٹا ہو جاتا تھا۔

اور اب وہ وقت آیا۔ کہ آدمی کا بچّہ بھری پنچایت کے سامنے پیش ہو۔ تھرن کی گردن پھول کر کُپّا ہو گئی۔ اور چندیا کے بال کھڑے ہو کر سُوئیوں کی طرح چبھنے لگے۔ بھیڑیئے نے اُٹھ کر زُلفی کی ٹانگ پکڑی۔ اور اس کو حلقے کے بیچوں بیچ لا کر بٹھا دیا۔ (ہم شاید یہ لکھنا بھول گئے ہیں۔ کہ بھیڑیئے کی بیوی نے اس بچے کا نام زُلفی رکھا تھا۔ اور پیار سے مینگھا بھی کہا کرتی تھیں کیونکہ ان کو آدمی کے بچے کی صورت مینڈک سے بہت ملتی جلتی معلوم ہوتی تھی) بچّہ پہلے تو کچھ بسورا۔ مگر پھر چاندنی میں چمکتی کنکریوں کو دیکھ کر خوش ہو کر ان سے کھیلنے لگا۔

چودھری نے پنجوں پر سے سر تک نہ اُٹھایا۔ اور اسی گھرگھراتی آواز سے پکارتا رہا۔ "بھیڑیو بھیڑیو۔ دیکھ لو۔ بھال لو۔ دستور کو نہ بھولو۔" اتنے میں چٹانوں کے پیچھے سے شیر خاں کی آواز اُترتی گھٹا کے بادل کی طرح گرجی۔ اور ہوا کے جھونکے کے ساتھ بھیڑیوں نے سُنا۔ کہ "اے بھیڑیوں کے سردار! یہ بچّہ ہمارا شکار ہے۔ اور ہم کو ملنا چاہیئے۔ بھیڑیوں کی آزاد قوم کو آدم زاد سے کیا واسطہ!"

چودھری نے اس فریاد پر اتنی توجّہ بھی نہ کی جتنی مُنہ کی مکھی اُڑانے میں کان کو زحمت ہوتی ہے۔ اور اسی طرح پنجوں پر مُنہ رکھے پکارتا رہا "بھیڑیو بھیڑیو دیکھ لو دیکھ لو۔ پہچان لو۔ ہم آزاد لوگوں کو سوائے اپنی قوم کے کسی کا حکم ماننے کی ضرورت نہیں۔ دیکھ لو اور پہچان لو۔ برادری کے بچّوں کو نہ بھولو"

شیر خاں کی آواز سنتے ہی سب برادر غرّانے لگے۔ اور ایک جوان بھیڑیا جو تین چار برس سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ اٹھا اور سردار سے مخاطب ہو کر بولا۔ "بے شک ہم آزاد لوگوں کو انسان سے کیا غرض اور واسطہ ہے"

اب ذرا قصّہ سمجھنے کے لئے جنگل کا ایک دستور اور سُن لیجئے۔ بھالو جی اپنی پوتھی میں لکھتے ہیں۔ کہ اگر کبھی کوئی بھیڑیا کسی بچے کو جو بھیڑیئے کا بچّہ نہ ہو اپنی برادری میں شامل کرنا چاہے تو جب تک برادری کے دو پنچ اور جو اس بچّہ کے ماں باپ نہ ہوں۔ بچّہ کو شامل کرنے کی رائے نہ دیں۔ اُس وقت تک وہ بچّہ غول میں ہرگز شامل نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ جملہ حاضرین کو اصول قانون میں غایت درجہ کی مہارت تھی۔ اس لئے صدرِ انجمن کی طرف سے سوال ہوا:۔

Taj Tahir Foundation

"اس بچے کا جو حمائتی ہو۔ وُہ کھڑا ہو۔ اور اپنی رائے ظاہر کرے"۔

جب کسی نے جواب نہ دیا۔ تو سوال پھر پڑھا۔ اس پر بھی جب کسی کی طرف سے کوئی صدا بلند نہ ہوئی۔ تو قہرن ہلکی سی جھُرجھُری لے جان کھونے کو مستعد ہوگئی۔ اور دل میں سوچ لیا۔ کہ آج کا مقابلہ بچے پالنے کی مصیبت سے ہمیشہ کو آزاد کردے گا۔ پھر نہ اپنا جی ہوگا نہ یہ عذاب۔

اب سنئے کہ بھیڑیوں کی پنچایت میں کسی غیر قوم کے جانور کو شریک ہونے یا گفتگو کرنے کا اختیار نہ تھا۔ مگر بھالو جی جھورے جو ایک بڑے کاہل وجود بھوری رنگت کے ریچھ تھے۔ اور بھیڑیوں کے بچوں کو بن کی پوتھی پڑھایا کرتے تھے۔ اس قاعدہ سے مستثنیٰ تھے۔ چونکہ صرف میووں اور شہد پر ان کا گذران تھا۔ اس لئے سب لوگ عزت کی نگاہ سے ان کو دیکھتے تھے۔ اور ان کی نقل و حرکت پر کوئی بھیڑیا معترض نہ ہو سکتا تھا۔ غرض جب دو دفعہ سوال پڑھا گیا۔ اور کسی نے جواب نہ دیا۔ تو ایک چٹان کے پیچھے سے بھالو جی یہ کہتے ہوئے نکلے "پنچو پنچو! ہماری بھی سُن لو ہم سیدھی اور سچی بات کے کہنے والے ہیں۔ جو کہیں وہ مان لو۔ اس آدمی

کے بچّہ کو غول میں شریک کرنے میں کچھ قباحت نہیں ہے۔ اس کی تعلیم و تربیت کے ہم ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بس ہماری اتنی سفارش کافی ہے"۔

یہ سُن کر چودھری چٹان پر سے بولا "بھائیو سُنتے ہو۔ بھالو ہمارے بچوں کا گرُو اور ہمارا بڑا ہے۔ سچی بات جو تھی وہ اس نے کہہ دی۔ اب ایک بھائی کوئی اَور اُٹھے۔ اور گرُو کی ہاں میں ہاں ملائے۔ تو اس بچے کا جی بچ جائے"۔

اتنا کہنا تھا۔ کہ ایک کالی کالی چمکتی پرچھائیں حلقے کے بیچوں بیچ دکھائی دی۔ اور بھیڑیوں میں غل پڑا۔ کہ بگھیرا آن پہنچا۔ دُم کی نوک اور ناک کی پھُننگ تک بالکل سیاہ جیسے اندھیری رات۔ سیاہ مخمل کی پوستین پر دھُوپ چھاؤں کے گُل بُوٹے کالی اطلس کی سی جھلک دکھاتے تھے۔ اس وقت جتنے بھیڑئیے موجود تھے وُہ بگھیرے کو خوب جانتے تھے۔ کیونکہ یہ وہ بزرگ تھے جن کو رستے میں ٹوکنا کسی بھیڑئیے کے لئے آسان کام نہ تھا۔ ذہانت و فطانت میں طباقی کے کان کاٹتے تھے۔ ہمت و مردانگی میں جنگلی بجار کے چچا تھے۔ اور جب بگڑ بیٹھتے تھے۔ تو مست ہاتھی کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ مگر زبان کے بہت میٹھے تھے۔ آواز ایسی

Taj Tahir Foundation

نازک اور شیریں تھی جیسے درخت کے پتّوں پر شہد کی بوندیں ٹپکتی ہوں۔ اور جلد ایسی نرم تھی جیسے ریشم کے لچھے ٭

جلسے میں قدم رکھتے ہی غرائے۔ کہ "اے قوم کے سردار اور سیونی کے آزاد بھیڑیو۔ گو مجھ کو اس مجمع میں گفتگو کرنے کا حق نہیں۔ لیکن چونکہ ایک بڑے اصول قانون کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اس لئے محض یہ کہنا ہے۔ کہ کسی مسئلہ قانون پر جو متعلق خونریزی کسی بچّہ شیر خوار کے ہو۔ اگر کوئی قطعی رائے قائم نہ ہو سکے تو ایک معقول معاوضہ قبول ہونے کے بعد اس بچّے کی جان کو سلامتی دی جا سکتی ہے۔ اور قانون نے کہیں تخصیص نہیں کی ہے۔ کہ اس معاوضہ کا پیش کرنے والا کون ہو۔ اب اہلِ جلسہ فرمائیں کہ جو کچھ عرض کیا۔ وہ واجب ہے یا غیر واجب؟"

بہت سے بھوکے بھیڑیئے جن کے پیٹ میں ہمیشہ آگ لگی رہتی ہے۔ بول اُٹھے۔ "بے شک آپ کا فرمانا بالکل بجا و درست ہے۔ بھائیو۔ سن لو۔ پیٹ کی آنچ بری ہوتی ہے۔ اگر کچھ کھانے کو ملے۔ تو اس بچّے کی جان سلامت چھوڑ دو۔ جنگل کا یہی دستور ہے"

بگھیرا۔ اچھا تو یہاں تک آپ نے میری بات کو تسلیم کیا۔

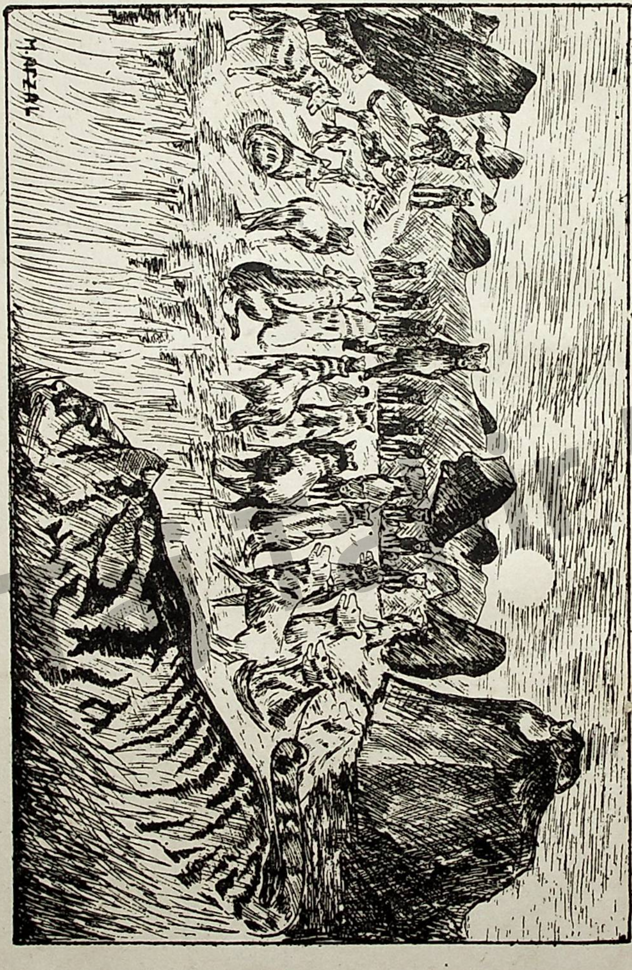

اب مَیں اجازت چاہتا ہُوں۔ کہ جو کچھ مجھے آگے کہنا ہے وہ بھی گذارش کروں"؟

بھیڑئیے۔ ہاں ہاں۔ ضرور ضرور ؛

بگھیرا۔ پہلی بات تو یہ ہے۔ کہ ایک دُودھ پیتے بھُوکے ننگے بچّے کو ہلاک کرنا سخت بُزدلی اور کوتاہ اندیشی کی بات ہے۔ ممکن ہے۔ کہ یہی بچّہ جوان ہوکر ایک زیادہ لذیذ اور فربہ شکار آپ صاحبوں کے حق میں ثابت ہو + دوسرا امر یہ ہے۔ کہ ابھی ابھی بھالوجی نے اِس بچّے کی سفارش کی ہے + مَیں کسی لائق نہیں۔ مگر اس سفارش کی تائید میں ایک بُہت فربہ اور خوبصورت بیل جس کو ابھی شکار کرکے یہاں سے ہزار قدم پر یُوں ہی چھوڑ آیا ہُوں۔ برادری کی ضیافت کے لئے پیش کرتا ہوں۔ اس کو قبول فرمائیے۔ مگر شرط یہ ہے۔ کہ اس آدمی کے بچّے کی جان ہی سلامت نہ رکھی جائے۔ بلکہ اس کو غول میں شریک ہونے کے بعد تمام ایسے حقوق وقتاً فوقتاً حاصل ہوتے رہیں۔ جو برادری کے ہر ایک آزاد بھیڑئیے کو حاصل ہؤا کرتے ہیں۔ آپ صاحبوں کو اس میں کیا عذر ہے؟

بھُوکے بھیڑئیے سب کے سب بول اُٹھے "ہرگز کسی قسم کا عذر نہیں۔ اس وقت کی ضیافت چھوڑنی حرام ہے۔ ہم کیوں اپنی

گردن پر خون لیں۔ جاڑے پالے میں آپ مرجائے گا۔ بھادوں کے مہینے شروع ہوتے ہی کام تمام کردیں گے۔ جاڑے میں بچ گیا۔ تو جیٹھ بیساکھ کی گرمی میں جل بھن کر خاک ہوجائے گا۔ ہاں ہاں ہم کو سب کچھ منظور رہے۔ وہ تازہ شکار فرمائیے کدھر ہے"؟

یہ غل سنتے ہی چودھری نے فقط ایک کان کھڑا کرلیا۔ اور چٹان پر سے آواز لگائی۔ "بھیڑیو بھیڑیو۔ دیکھ لو۔ سمجھ لو۔ بات کو نہ بھولنا"۔

زلفی جس جگہ بیٹھا تھا۔ وہیں بیٹھا کنکریوں سے کھیلتا رہا۔ اور کچھ خبر نہ ہوئی۔ کہ کس طرح ایک ایک بھیڑیا اس کے پاس آیا۔ اور اس کو خوب اچھی طرح پہچان کر چلا گیا۔ غرض جلسے کے جب اور سب امور طے ہولئے۔ تو پنچایت برخاست ہوئی۔ بھیڑیے شکار کا پتہ پوچھ کر ضیافت کھانے چل دیئے۔ اور پہاڑ کی چوٹی پر اب فقط چودھری۔ بھالو۔ بگھیرا۔ زلفی اور اس کے نئے اماں باوا رہ گئے۔ شیر خاں رات کے سناٹے میں پچھلے پہرے تک دہاڑتے رہے۔ بہت خفا تھے کہ زلفی نے ڈاڑھ گرم نہ کی۔

جب کبھی ہوا کے جھونکے کے ساتھ دور کی پہاڑیوں سے شیر کے دہاڑنے کی آواز آتی تھی۔ تو بگھیرا بے اختیار یہ شعر

پڑھتا تھا۔

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا

اب تو غصہ میں دہاڑتے ہو۔ میری جان۔ کوئی دن جاتا ہے کہ موت کی تکلیف میں دہاڑو گے۔ یہ آدمی بد بلا۔ ہم سے نہ پوچھو"۔

کچھ سکوت کے بعد چودھری بولے۔ "آج کی پنچایت اچھی ہوگئی۔ بات زیادہ بڑھنے نہ پائی۔ سچ ہے۔ انسان اور انسان کی نسل نہایت عاقل و زیرک ہے۔ گو ہم کو اپنی قوت و درندگی پر بہت ناز ہے۔ لیکن ممکن ہے۔ کہ یہی بچہ جو اس وقت ایسا حقیر و ناتواں ہے۔ ایک دن ہمارا قوت بازو بن جائے۔ اور ضرورت کے وقت ہر طرح کی مدد کرے"۔

بگھیرے نے کہا۔ "بجا ہے۔ کچھ شبہ نہیں۔ کہ آئندہ اس بچے سے بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ جو منصب حکومت اس وقت قوم کے سردار کو حاصل ہے اس کو دوام نہیں"۔

چودھری یہ فقرہ سن کر پی گیا۔ اور اس وقت ناگزیر کو سوچنے

Taj Tahir Foundation

لگا۔ جو ایک قوم کے سردار کو ایک نہ ایک دن پیش آتا ہے یعنی وہ وقت جب کہ قوت زائل ہوتے ہوتے شکار مارنے کی طاقت نہیں رہتی۔ اور سب بھیڑئیے مل کر سردار کو ہلاک کر دیتے ہیں تاکہ اُس کا جانشین بنائیں۔ اور جب اس کا وقت آئے۔ تو اس کو بھی پھاڑ کھائیں۔ چودھری جب اس فکر سے کسی قدر ہوشیار ہوا۔ تو بھیڑئیے اور اُس کی بیوی سے کہنے لگا۔ "اچھا اب خدا حافظ۔ جاؤ اور اس بچّے کو اچھی طرح تعلیم و تربیت کر کے جنگل کا سُورما بناؤ"۔

غرض اس طرح ہمارا پیارا زُلفی بھالو جی کی سفارش اور بگھیرے کی ضیافت سے سیونی کے بھیڑیوں کا بھائی برادر بن گیا۔

زُلفی کا لڑکپن

اب ہم کو دس بارہ برس آگے بڑھ جانا چاہیئے۔ کیونکہ اگر اس زمانہ کے حالات یہاں لکھیں گے تو قصّہ طُول پکڑ جائے گا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی ہے۔ کہ اس عرصے میں زلفی کی پرورش بھیڑئیے کے بچّوں کے ساتھ ہوتی رہی۔ یہ بچّے تو جلدی جوان ہو کر بڑے شکاری بھیڑئیے ہو گئے۔ لیکن ہمارا زلفی بچّہ یا یہ کہو

کہ لڑکا ہی رہا۔ تعلیم و تربیت میں ماں باپ کی طرف سے کمی نہیں ہوئی۔ ذہن کا ہمیشہ سے تیز تھا۔ تمام صحرائی علوم و فنون جلد سیکھ لئے۔ اور تھوڑے ہی زمانہ میں جنگل کے کاروبار میں بڑا مشّاق ہو گیا۔ یہاں تک کہ رات کے سنّاٹے میں گرم ہوا کے جھونکے پتّوں کا کھڑکا۔ گھاس کی آہٹ۔ سر پر اُلّو کی آواز۔ پانی میں مچھلیوں کی اُچھل کود۔ یا ڈالی پر گرتے ہی چمگادڑ کے اُلٹا لٹک جانے کا مطلب وہ اسی طرح سمجھنے لگا۔ جیسے کوئی پڑھا لکھا آدمی اپنے دفتر کا کام کرتا ہے۔ چھُٹی کے وقت اکثر دھوپ میں پڑے پڑے سو جاتا تھا۔ بھوک پیاس ستاتی۔ تو کچھ کھا پی کر ایک نیند لے لیتا۔ جب گرمی سے جی گھبراتا۔ یا بدن پر مَیل کاٹنے لگتی۔ تو کسی پوکھر ندی یا تالاب میں جا کر خوب تیرتا۔ اور بہ خوش ہوتا۔ شکار کھاتے کھاتے جی اُکتا جاتا۔ تو درختوں پر چڑھ شہد کا چھتّہ توڑ لاتا۔ اور اس کو خوب مزے لے لے کر کھاتا۔ شہد کی چاٹ بھالو جی نے لگا دی تھی۔ اُن کا مشہور مقولہ تھا۔ کہ تازے تازے میووں اور شہد کے مقابلہ میں گوشت کی کچھ حقیقت نہیں۔ پاپ بھی ہو۔ دھرم بھی جائے۔ اور خاک مزا بھی نہ آئے۔

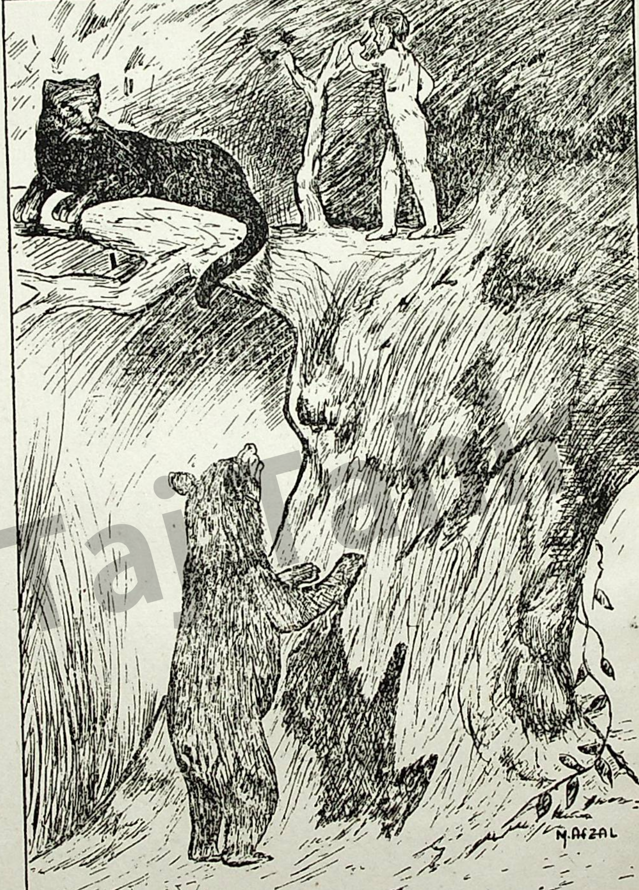

زلفی درخت پر خوب چڑھتا تھا۔ کیونکہ اس فن میں مدتوں بگھیرے کی شاگردی کی تھی۔ بگھیرا کسی اونچے پیڑ کے موٹے سے موٹے ٹھنے پر خوب آرام سے جا بیٹھتا تھا۔ اور پکارتا تھا۔ کہ آؤ بھائی زلفی۔ تم بھی یہاں چلے آؤ۔ جگہ بہت ہے"۔

پہلے پہل تو زلفی کو بڑا ڈر لگتا تھا۔ مگر پھر کوئی دن میں ایسی مشق ہوگئی۔ کہ لمبی دُم کے کالے مُنہ والے لنگور بھی جو اس فن کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ اس کے سامنے کان پکڑنے لگے۔ مہینے کے مہینے پنچایت میں شریک ہوتا تھا۔ اور وہاں خالی بیٹھا بھیڑیوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔ کسی کو تاب نہ تھی۔ کہ اس سے بازی لے جائے۔ بازی تو درکنار ایک پل کسی کی آنکھ نہ ملتی تھی۔ مدتوں زلفی کو یہ ہی کھیل رہا۔ یار دوست سب اس کے محتاج رہتے تھے۔ کیونکہ جب کسی کے پنجے یا پوستین میں کانٹے چُبھ جاتے تو یہ ان کو نکال دیتا۔ یا اگر کسی یار کو چچڑیاں ستاتیں۔ تو یہ ایک ایک کر کے چُن لیتا۔ کبھی کبھی رات کو بھٹ سے نکل کر پہاڑ کے نیچے جوار باجرے کے کھیتوں میں نکل جاتا۔ اور گنواروں کے گھر دیکھ کر پہلے تو تعجب کرتا۔ اور پھر بیزار ہو کر گھر چلا آتا۔

کچھ عرصے سے انسان کو وہ بہت بے وفا اور مکار جانور

سمجھنے لگا تھا۔ کیونکہ ایک دفعہ حضرت انسان کی ایک بڑی کاریگری اس کی نظر سے گذری تھی + قصہ یہ ہُوا تھا۔ کہ جاڑے کے موسم میں ایک رات بگھیرے کے ساتھ گشت کو نکلا۔ اتفاق سے ایک کھیت سے دُوسرے کھیت میں جو جانے لگا۔ تو گھاس میں چُوہے دان کی قطع کا ایک صندوق جس کا پٹرا اُوپر کو اُٹھا تھا نظر پڑا + زلفی تو اس کو خاک بھی نہ سمجھا۔ کہ کیا بلا ہے لیکن بگھیرے کو اس کی حقیقت معلوم تھی۔ لیاقت دکھانے کا شوق ایسا چرایا۔ کہ جھٹ صندوق کے پاس جا اس کی ترکیب سمجھانے لگا + وُہ تو خدا نے خیر کر لی۔ ورنہ گردن پھنسنے میں کیا باقی رہا تھا + اُس دن سے زلفی کو انسان کے دغا باز ہونے کا پورا یقین ہو گیا تھا ٭

بگھیرے کو زلفی سے بڑا اُنس پیدا ہو گیا تھا۔ اور گرمی کے دِنوں میں جب دھُوپ بہت ستاتی تھی۔ تو یہ دونوں دُور کسی جنگل میں چھاؤں اور ٹھنڈک کی کوئی جگہ نکال کر دن کاٹ دِیا کرتے تھے + شام ہوتے ہی بگھیرا شکار کھیلا کرتا تھا۔ اور زُلفی تماشا دیکھتا تھا۔ کہ بگھیرا تھوڑی ہی دیر میں دائیں بائیں شکار مار کر جانوروں کا ڈھیر لگا دیتا ہے + زلفی بھی غضب کا شکاری

Taj Tahir Foundation

ہوُا تھا۔ کوئی چیز نہ چھوڑتا تھا۔ گائے بیل مارنے کی البتہ اُس کو قسم دلا دی گئی تھی۔ اور بگھیرے نے سمجھا دیا تھا۔ کہ "میاں زلفی سارا جنگل تمہارا ہے۔ جس جانور کو مار سکو۔ شوق سے مار کر تناول فرماؤ۔ لیکن گائے بیل یا بچھڑے بچھیا کو بھولے سے بھی نہ ستانا۔ احسان فراموشی ہم لوگوں میں بھی بڑا عیب ہے۔ یہ ایک جوان خوبصورت بیل کی جان کا صدقہ ہے۔ کہ آج آپ کی صُورت چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔ جو وُہ اپنے خون سے تمہاری جان کا مول نہ دیتا۔ تو بھیڑیئے تو اب تک آپ کو کھا پی کر بھول بھی گئے ہوتے"۔ زلفی نے ہمیشہ اس نصیحت پر عمل رکھا۔

اب سُنو۔ کہ جس قدر زمانہ گزُرتا گیا۔ زلفی خوب چُست و چالاک توانا و مضبوط ہوتا گیا۔ اور سچ ہے جس لڑکے کو مدرسے یا پاٹ شالے میں بیٹھ کر سبق یاد نہ کرنا پڑے۔ اور سوائے شکار کے کسی بات کی دُھن نہ ہو۔ وہ کیوں جلدی ہاتھ پاؤں نکال کر کڑیل جوان نہ ہو جائے۔

بچے تو سب ہی پیارے تھے۔ لیکن زُلفی پر بی قھرن جان فدا کرتی تھیں۔ اکثر سمجھایا کرتی تھیں۔ کہ بیٹا خدا کے لئے شیرخاں پر کبھی بھروسہ نہ کیجئو۔ یہ مُوذی بڑا دغا باز ہے۔ زلفی گو اپنے

تئیں بھیڑیا سمجھتا تھا۔ لیکن پھر آدمی کا بچہ تھا۔ ماں کی نصیحت کو بھُول بھول جاتا تھا۔ شیر سے رستے میں کبھی کبھی ملاقات ہوتی تھی۔ زلفی نے چاہا بھی۔ کہ صاحب سلامت پیدا کرے۔ لیکن شیر نے ہی مُنہ نہ لگایا۔ اب کچھ عرصے سے شیر کی آمد و رفت اس طرف بہت زیادہ رہنے لگی تھی۔ وجہ یہ تھی۔ کہ چودھری بھیڑیوں کا سردار بُوڑھا ہو چلا تھا۔ اور نئی پود کے بھیڑیئے اب اس کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے۔ شیرخاں نے اس موقع کو غنیمت جانا۔ اور جوان بھیڑیوں سے رسم پیدا کرنی شروع کی۔ کم سنی میں عقل تو کچی ہوتی ہی ہے۔ اکثر نادان بھیڑیئے گل کی پیدائش نیچے کھُچے شکار کے لالچ میں شیرخاں کے ساتھ رہنے لگے۔ چودھری کا ضعف اب اس حد کو پہنچا تھا۔ کہ وہ اپنے اختیارات کو پورے طور پر عمل میں نہ لا سکتا تھا۔ ورنہ اس کو یہ ذِلت کب گوارا ہو سکتی تھی۔ کہ ایک آزاد قوم کے نوجوان بے غیرت بن کر شیرخاں کی غلامی کو اعزاز کا تمغہ سمجھیں۔ شیرخاں کا وطیرہ اب یہ تھا۔ کہ جوان بھیڑیوں کو چاپلوسی کی باتوں سے گمراہ کرتا تھا۔ اور تاسّف کر کے ان سے کہتا تھا۔

"ارے بدنصیبو۔ یہ تمہاری جوانی۔ یہ پھُرتی۔ یہ صیّادی۔ اور پھر کیا خدا کی پھٹکار ہے۔ کہ ایک بُوڑھے مرن ہار بھیڑیئے

Taj Tahir Foundation

اور ایک دو ٹانگ کے پلّے یعنی آدم زاد کی غلامی کرتے ہو + بلکہ مشہور تو یہ ہے۔ کہ اس آدمی کے لڑکے سے تم چار آنکھیں تک نہیں کر سکتے۔ آفرین ہے اس کی آدمیت پر۔ اور حیف ہے تمہاری گرگُیت پر۔ کہ ایسے کمزور جانور سے ایک پل آنکھ نہ ملا سکو۔" بھیڑیئے یہ ملامت سُن کر سخت شرمندہ ہوتے تھے۔ اور غیرت کے مارے گردنیں پُھلا پُھلا کر غرّانے لگتے تھے ؛

بگھیرے کا تردّد

بگھیرا جس کی فہم و فراست جنگل جنگل مشہور تھی۔ یہ سب خبریں سُنتا رہتا تھا۔ زُلفی کو سمجھاتا تھا۔ کہ "دیکھو صاحب زادے ہوشیار رہنا۔ ایک نہ ایک دن یہ شیر خاں تم کو چٹ کر جائینگے" ؛

زُلفی سُن کر ہنستا تھا۔ اور کہتا تھا۔ کہ تمہارے اور برادری کے ہوتے تو یہ نہیں ہو سکتا۔ اور پھر بھالُو جی میرے موٹے گُرو بھی تو ہیں۔ گو ان کو خورد و خواب سے کم مُہلت ملتی ہے لیکن میری حمایت میں تو وُہ بھی بھوں بھوں کر کے دو چار ٹُکّے لگا ہی دینگے"

اب ایک دِن کا ذکر سُنئے۔ جب دن چڑھے گرمی زیادہ ہوئی تو بگھیرا اور زلفی باتیں کرتے ہوئے دُور ایک بن میں جا نکلے۔

درختوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں دیکھ کر ایک ستھری سی جگہ بیٹھ گئے۔ زُلفی بگھیرے کی نرم گردن پر سر رکھ کر لیٹ رہا۔ بگھیرا بالکل چپ تھا۔ اور اکثر آنکھیں بند کر کے دایاں پنجہ چاٹنے لگتا تھا + معلوم ہوتا تھا۔ کہ بہت فکر مند ہے + زلفی کو چھاؤں ایسی بھلی لگی۔ کہ آنکھ جھپکنے لگی + بگھیرے نے سوچتے سوچتے زلفی کو ہوشیار کیا۔ اور کہا "زلفی۔ زلفی۔ بار بار کہہ چکا ہُوں۔ کہ شیر تمہارے خون کا پیاسا ہو گیا ہے۔ مگر تم کو مطلق خیال نہیں + اگر تم اس بات کو نہ پہنچے۔ تو سخت پچتاؤ گے" ؛

زلفی نے آنکھیں کھول کر کہا "بار بار کہنا کیسا۔ آپ نے تو یہ بات اتنی دفعہ کہی ہے۔ کہ سامنے کی جھاڑی پر اتنے بیر بھی نہ ہوں گے + (زلفی کو گنتی کہاں آتی تھی۔ کہ ٹھیک ٹھیک بتاتا) پر اس وقت اِس ذکر کی کیا ضرورت تھی۔ میرا تو نیند کے مارے بُرا حال ہے۔ آپ کو شیر خاں کی پڑی ہے + وُہ تو یُونہی بکا کرتا ہے۔ نام کو تو شیر ہے۔ پر سوائے مور کی طرح اِترا اِترا کر ناچنے اور جھنکارنے کے اس کو آتا ہی کیا ہے"؟

بگھیرا۔ ذرا اُٹھ کر بیٹھو۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ کچھ خبر بھی ہے۔ پہلے تو شیر دِل ہی دِل میں تمہارا دشمن تھا لیکن

اب اس کی عداوت کسی پر پوشیدہ نہیں۔ مجھے تو شروع ہی سے ایک ایک بات کا علم ہے۔ اب بھالو جی کو خبر لگ گئی ہے۔ بھیڑیوں کے بچّے بچّے کی زبان پر یہ ہی قصّہ ہے۔ جنگل میں جگہ جگہ اسی کا چرچا ہے۔ چرند پرند کون نہیں جانتا۔ دُور کیوں جاؤ۔ وہ سامنے درختوں کی اوجھل جو ہرنوں کی بھولی بھولی ڈاریں چرتی ہیں۔ ان تک کو شیر کی عداوت کا حال معلوم ہو گیا ہے۔ خود طباقی نے کئی دفعہ صاف صاف تمہارے منہ پر کہا۔ پر افسوس تُمہارے کان پر جُوں نہ چلی ۔

زلفی۔ واہ واہ۔ یہ تو آپ نے خوب یاد دلایا۔ طباقی کا حال تو مَیں نے آپ سے کہا ہی نہیں۔ ایک دن اُس بے غیرت نے مجھے ننگا دھڑنگا کہہ کر چھیڑا۔ مجھے بھی غصہ آیا۔ اور دوڑ کر دُم پکڑ لی۔ اور اُدھر اُٹھا کر اتنی پھک پھیریاں دیں۔ کہ یاد ہی کرتا ہوگا۔ جب چیختا چلاّیا۔ تو دھائیں سانی ایک درخت سے دے مارا۔ دُور جا کر پڑا۔ اور دو چار لڑکنیاں کھا سیدھا منہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا اس زور سے بھاگا۔ کہ ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے ۔

زلفی اتنا کہہ پھر زور زور سے ہنسنے لگا ۔

بگھیرا۔ بڑی بے وقوفی کی حرکت تھی۔ طباقی بڑا حرفوں کا بنا ہے۔ اُس کو یار بنا لیتے تو بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہتیں۔ یہ بڑی نادانی تھی کہ اُس کو مار کر بھگا دیا۔ پھر سوئے جاتے ہو ذرا سنبھل کر اپنے سہارے بیٹھو۔ بات یہ ہے کہ اِس جنگل میں تو کسی کی مجال نہیں۔ کہ تم کو ہاتھ لگا سکے۔ لیکن مشکل یہ بنی ہے کہ چودھری بڈھا ہو چلا ہے۔ اور اب کوئی دن جاتا ہے۔ کہ اس سے شکار نہ مارا جائے گا۔ جس دن یہ نوبت آئی۔ اُسی دن برادری والے اس کی چودھرات چھین لیں گے۔ تم کو کیا خاک یاد ہوگا۔ دُودھ پیتی جان تھے۔ دس برس سے زیادہ کا زمانہ گذرتا ہے۔ کہ جس وقت تمہارے بھیڑئیے اتاں باوا نے تمہیں پنچایت کے سامنے لا کر ڈالا۔ تو بہت سے بھیڑیوں کو تمہارا غول میں شریک ہونا ناگوار ہؤا۔ وہ بھیڑئیے اب تک جیتے ہیں۔ جو اُس وقت جوان تھے اب بڈّھے ہیں۔ اور جو بچّے تھے۔ وُہ جوان ہو کر شیر کے چیلے بنے ہیں۔ اور تمہارے خون کے پیاسے اور گوشت کے بھوکے ہیں ۔

زُلفی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ مجھ میں وُہ کون سا نقص ہے۔ کہ بھیڑئیے مجھ کو اپنی برادری سے نکال دیں؟ اسی جنگل میں

Taj Tahir Foundation

پیدا ہُوا۔ یہیں پرورش پائی۔ ہمیشہ بھائیوں کی خدمت کی۔ جس بھائی کے پنجے یا پوستین میں کانٹے چُبھے وُہ نکالے۔ چچڑیاں چُھڑائیں۔ سب طرح کا دُکھ دُور کیا۔ پھر مُجھ سے دُشمنی کرنے کا کیا سبب ہے۔ وُہ میرے بھائی ہیں۔ مَیں ان کا بھائی ہُوں۔ دُشمنی بیچ میں کیونکر آن کُودی؟

بگھیرا اتنا سُنتے ہی ٹھنڈی زمین پر ہاتھ پاؤں پھیلا چت لیٹ گیا۔ اور مُنہ اُونچا کر کے سر پیچھے کو ڈال کر کہنے لگا۔ بھائی زُلفی ذرا میرے جبڑے کے نیچے گردن میں ہاتھ ڈال کر دیکھو تو یہ کیا چیز ہے؟

زلفی نے اپنا سُوکھا سخت لکڑی سا ہاتھ بگھیرے کی گردن میں ڈال کر ٹٹولنا شروع کیا۔ تو ٹھوڑی کے نیچے جہاں ریشم سے نرم بالوں میں گردن کے مضبوط رگ پٹھے پوشیدہ تھے۔ ایک جگہ معلوم ہُوا۔ کہ جلد پر سے بال اُڑ گئے ہیں۔ اور کھال موٹی پڑ گئی ہے۔ جب زلفی کا ہاتھ ٹھوری کے نیچے پہنچ لیا۔ تو بگھیرے نے کہا۔ بھائی زُلفی اس جنگل میں سوائے میرے کوئی نہیں جانتا۔ کہ بگھیرے کی گردن میں کوئی نشان ہے۔ اور نشان بھی کس چیز کا۔ طوق کا۔ سُن پیارے زُلفی مَیں وہ ناشاد

نامراد بگھیرا ہُوں۔ جو انسان کے گھر میں پیدا ہُوا۔ جس کی ماں راجستھان کے ایک محل میں مُدتوں قید میں رہ کر مری۔ رانیوں اور راجکماریوں کی مصاحبت میں زندگی عیش آرام سے بسر ہوئی۔ مگر قید پھر قید تھی۔ لوہے کے پنجروں میں زندگی کا بڑا حصّہ گذرا۔ سلاخوں میں سے ہمیشہ کھانا ملا۔ لوہے کے تسلے سے ہمیشہ پانی پیا۔ قید میں صحرا کے چشمے اور جنگل کی ہریاول کہاں۔ غرض اس حالتِ اسیری میں انسان سے طبیعت مانوس ہوگئی۔ اور یہی باعث تھا۔ کہ آج سے دس برس پہلے اور آج تک تیری جان بچانے میں کبھی کسی بات سے دریغ نہیں کیا۔ لیکن خیر اس کا ذکر فضول ہے۔ اپنا قصہ مختصر یہ ہے کہ زنداں ہی میں پیدا ہوئے۔ اور زنداں ہی میں پروان چڑھے۔ جنگل کی صورت کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی۔ یہاں تک کہ ایک رات طبیعت بہت گھبرائی۔ اور خود بخود خیال آیا۔ کہ اے بدنصیب ماں کے بدنصیب بچے۔ تُو پھر بگھیرا ہے۔ آدمی کا کھیل نہیں۔ اس خیال کے آتے ہی کچھ ایسا جنون سوار ہُوا۔ کہ ایک ہی پنجے میں قفلِ زنداں کو توڑ ڈالا۔ اور جنم قید سے اپنے آپ کو آزاد کیا۔ جب وقت جنگل میں پہنچا۔ تو یہاں کے لوگوں نے شیر سے بھی زیادہ میرا خوف کیا۔ کیونکہ میں نے آدمیوں میں رہ کر انسان کی عقل

Taj Tahir Foundation

سیکھی تھی"۔

زلفی نیند کا ماتا تو ہو ہی رہا تھا۔ کہانی سُنتے سُنتے بالکل سو چلا۔ لیکن جب بگھیرا چپ ہُوا۔ تو آنکھیں بند کی بند مُسکرا کر کہنے لگا۔ "جنگل والوں نے آپ سے خوف کیا ہوگا۔ مَیں تو آپ سے ذرا بھی نہیں ڈرتا"۔

بگھیرا زلفی کی اس بھولی بات پر بے اختیار ہنس دیا۔ اور بولا "تیری بلا جانے ڈر کس کو کہتے ہیں۔ آخر کار انسان کا پُوت ہے جانور تو نہیں ہے۔ خیر ذرا اُٹھ کر بیٹھو۔ اس ذکر کو اس لئے چھیڑا تھا۔ کہ مَیں جنگل کا جی تھا۔ آخر کار جنگل میں پہنچ گیا۔ تُو انسان ہے اور بھیڑیوں سے جان سلامت بچ گئی۔ تو تُو بھی ایک دِن اپنے ہمجنسوں میں جا کر آباد ہو جائے گا"۔

زلفی۔ یہ سب کچھ سہی۔ پر بھیڑیوں سے کیوں میری جان سلامت نہ بچے گی؟

بگھیرا۔ ذرا اُٹھ کر میری طرف دیکھو تو بتاؤں۔

زلفی نے اُٹھ کر بگھیرے سے آنکھیں ملائیں۔ ایک لمحہ نہ گُذرا تھا۔ کہ آنکھیں جھپک جانی تو درکنار وہ شیر کا سا کلہ اور بھاری بھرکم گردن تک دُوسری طرف کو پھر گئی۔

بگھیرے نے نشست بدل کر زمین پر زور سے پنجہ مارا اور کہا۔ "اب بھی سمجھے کہ عداوت کا کیا سبب ہے۔ مَیں بگھیرا ہُوں۔ آدمیوں میں پلا ہُوں۔ تمہارے ساتھ غایت درجہ اُنس رکھتا ہوں پھر یہ حال ہے۔ کہ ایک پل تمہاری آنکھوں کے سامنے اپنی نظر نہیں ٹھہرا سکتا۔ بس یہ ہی تمہاری نظر کے سامنے کسی کی نظر کا نہ ٹھہرنا۔ دُوسروں سے عقل میں تمہارا زیادہ ہونا۔ ہمدردی کر کے بھیڑیوں کے تلووں سے خار چُننے۔ یہی عداوت کے اسباب ہیں۔ فقط تمہارا انسان ہونا ان کی عداوت کی دلیل ہے"۔

زلفی کی تیوری پر بل پڑتے ہی کالی کالی جُٹی بھوؤں کے نیچے دیدے سُرخ ہو گئے۔ اور آزردہ ہو کر بولا "بھائی میرے مجھے ان باتوں کی کیا خبر تھی۔ بھلائی کرو بُرائی ملے۔ یہ بات تو کچھ سمجھ میں نہیں آتی"۔

بگھیرا۔ ہاں پیارے زلفی۔ جنگل کا یہی دستور ہے۔ پہلے پنجہ۔ پھر زبان۔ چھُوٹتے ہی طمانچہ رسید کرو۔ پھر بات سو بات۔ تمہاری اس بے پروائی کا تو رونا ہے۔ جس سے ظاہر ہے۔ کہ آخر پھر ہو تو انسان ہی۔ پر اب اتنے بڑے ہو گئے سمجھ سیکھو۔ اپنی بُرائی بھلائی دیکھو۔ اس دفعہ اگر چودھری سے شکار چھُوٹ گیا۔

Taj Tahir Foundation

اور بارہ سنگا نہ مر سکا۔ تو بس سمجھ لو۔ کہ تمہارا قصّہ بھی تمام ہوُا۔ ساری برادری تم پر اور چودھری پر ٹوٹ پڑے گی۔ پھر جان بچنی ناممکن ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھو۔ کہ اس دفعہ کا شکار چودھری کے بس کا نہیں ہے۔ اس غریب کا حال تم جانتے ہی ہو۔ پہلے تو خیر کچلیاں ہی ہلتی تھیں۔ اب پنجوں میں ناخن بھی بیکار ہو چلے ہیں۔ شکار چھوٹتے ہی دوسرے دن پنچایت بیٹھ جائے گی۔ اور سردار کو ہلاک کرتے ہی تم کو تکا بوٹی کر دیا جائے گا۔ لیکن خیر تمہاری محبّت نے دیوانہ بنا رکھا ہے۔ ہم سے بھی جو بن پڑے گا کریں گے۔ اور ایک بات ہو جائے تو واہ واہ کیا کہنا ہے"۔

اتنا کہتے ہی بگھیرا جوش میں آ زمین سے چار ہاتھ اُونچا اُچھل گیا۔ اور خوش ہو کر بولا "پوچھو وہ کیا بات ہے"؟

زلفی نے حیران ہو کر کہا "آپ ہی فرمائیے۔ میری سمجھ سے باہر ہے"۔

بگھیرا۔ بات کچھ نہیں ہے۔ ذرا سی تکلیف کرو۔ اُٹھو۔ اور پہاڑ کے نیچے آدمیوں کی بستی میں چلے جاؤ۔ اور گھروں میں چُھپکے چُھپکے جھانکتے پھرو۔ جہاں کہیں کسی جھونپڑی میں تم کو لال لال دہکتے ہوئے پھُول نظر آئیں۔ ان کو چُن کر کسی چیز میں لے آؤ۔

پھر بہار دیکھنا۔ کہ ان سُرخ گل بُوٹوں سے جو کام نکلے گا۔ وُہ نہ بگھیرے کی دوستی کام دے گی۔ نہ بھالُو کی خیر خواہی۔ بس ابھی چل دو۔ دیر نہ لگاؤ"۔

لال لال پھُولوں سے بگھیرے کی مُراد آگ تھی۔ جنگل کے سب جانور اس چیز سے ایسے ڈرتے ہیں۔ کہ اس کا نام نہیں لیتے۔ اور اَور بہت سے نام ایجاد کر رکھے ہیں۔ جو آگ کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

زلفی۔ لال پھُول؟ اچھا وُہ چیز جو کبھی جھونپڑیوں کے اندر کبھی باہر سُورج ڈوبتے ہی چمکا کرتی ہے۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ ابھی لو۔

بگھیرا۔ کیوں نہ ہو۔ آخر آدمی ہے۔ تیرے برابر زُود فہم کون ہو سکتا ہے۔ پر زلفی جاتے تو ہو۔ اتنا خیال رکھنا۔ کہ ان پھُولوں کے آس پاس ہی کہیں کوئی مٹّی کی ہنڈیاں پڑی ہونگی۔ ایک ہنڈیا اُٹھا کر جلدی جلدی چُن کر اس میں ڈال دینا۔ نہیں تو وہ کاٹ لیں گے۔ یہ پھُول کانٹوں سے بھی زیادہ تیز ہوتے ہیں۔

زلفی۔ "اچھا تو لیجئے مَیں چلا۔ پر میرے پیارے"۔ اور

Taj Tahir Foundation

اتنا کہہ زلفی نے بگھیرے کی خوبصورت نرم گردن میں باہیں ڈال دیں۔ "پیارے بگھیرے اتنا بتا دو۔ کہ کیا یہ سب کرتوت شیر خاں کے ہیں؟"

بگھیرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور کہنے لگا۔ "پیارے زلفی۔ قسم ہے اس قفلِ زندان کی جس نے اسیری سے آزاد کیا۔ کہ ساری یہ مصیبت شیر خاں تمہارے سر پہ لایا ہے"۔

زُلفی۔ تو بس مجھے بھی سوگند ہے اُس جاندار کی جس نے اپنے خون سے میری جان کا مول دیا ہے۔ کہ شیر خاں میرے ساتھ کچھ نہ کر سکا۔ جو میں اس کے حق میں کروں گا"۔

اتنا کہہ زلفی یہ جا وُہ جا۔

دہکتے ہُوئے پھُول

زلفی جُوں ہی درختوں کی اوجھل ہُوا۔ بگھیرے نے بڑے درد سے کہا۔ "ارے انسان ارے انسان! تجھ کو خُدا نے عجب مخلوق بنایا ہے۔ تیرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ افسوس تو اس کالی دھاریوں والے احمق کا ہے۔ او بدنصیب شیر شکار تو تُو نے بُہت مارے پر آج سے دس برس پہلے یہ آدم زاد شکار

تیرے حق میں پیغام اجل ہو گیا"۔

زلفی دیر تک بن میں دوڑتا ندی نالے تیرتا پھاندتا شام ہوتے گھر پہنچا۔ بھٹ کے پاس کچھ دیر دم لے کر اندر دیکھا۔ تو کوئی نہ تھا۔ بھائی سب شکار کو نکل چکے تھے۔ اماں البتہ بھٹ کے پیچھے خاموش بیٹھی تھیں۔ زلفی کو ہانپتے دیکھ کر سمجھیں۔ کہ آج بچّہ کچھ پریشان ہے۔ پُوچھنے لگیں۔ "بیٹا خیر ہے۔ آج ایسے سراسیمہ کیوں ہو؟"

زلفی۔ جی کچھ نہیں۔ شیر خاں کی شتر گربگیوں نے جان غضب میں دے دی ہے۔ آج ذرا کھیتوں میں شکار کھیلنے جاتا ہُوں۔

اتنا کہہ جھاڑیوں کو کُودتا پھاندتا پہاڑ سے اُتر کر ندی کے کنارے آیا۔ چاہتا تھا۔ کہ قدم تیز کر کے کھیتوں میں اُترے۔ کہ ایک دفعہ ہی بُہت سے بھیڑیوں کا شور سُنا۔ شور سُنتے ہی زلفی کے پاؤں ایک ایک من کے ہو گئے۔ گردن موڑی، تو کیا دیکھتا ہے۔ ایک جوان مست بارہ سنگھا کچھ دُور ندی کے کنارے ایک اونچے ٹیلے پر ہر طرف سے گھرا کھڑا ہے۔ سارا بدن کانپ رہا ہے۔ اور کان کھڑے کئے پھُنکارے مارتا ہے۔ چاروں طرف

Taj Tahir Foundation

گھبرا گھبرا کر نظر ڈالتا ہے۔ کہ کہیں رستہ ملے۔ تو چار چوکڑیوں میں دشمن کی زد سے کہیں کا کہیں نکل جائے۔ مگر ہر طرف بھیڑیوں کے غول ہوشیار کھڑے ہیں ؛

زلفی دل میں سوچنے لگا۔ کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ کہ اتنے میں سب بھیڑیئے مل کر چلائے۔ "چودھری کدھر ہے۔ چودھری کو لاؤ۔ شکار کو گھیر لیا ہے۔ آئے اور اس بارہ سنگے کو مارے۔ نہیں تو ...."

اِتنا کہنے نہ پائے تھے۔ کہ چودھری آیا۔ اور دو چار چکر کاٹ کر بارہ سنگے پر گرا۔ چودھری کو دیکھتے ہی زلفی اس قصّے کو سمجھ گیا۔ اور اس زور سے بھاگا۔ کہ تھوڑی ہی دیر میں بھیڑیوں کا شور اس کے کانوں میں ہلکا ہوتے ہوتے بالکل جاتا رہا۔ زلفی اِتنا ضرور سمجھ گیا۔ کہ چودھری کا وار خالی گیا۔ آخر کار بھاگتے بھاگتے کسانوں کے گھر تک پہنچ گیا۔ اور ایک جھونپڑی کے پیچھے پولیوں کے ڈھیر میں چُھپ کر ہو بیٹھا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ کہ بگھیرا سچ کہتا تھا۔ کہ کل کا دن میرے اور چودھری کے حق میں قیامت سے کم نہ ہوگا ؛

جب ذرا دم قابو میں آیا۔ تو کھڑے ہو کر دیوار کے موکھے میں سے جھونپڑی کے اندر جھانکنے لگا۔ دیکھا۔ ایک طرف الاؤ

لگا ہے۔ کسان کی جورو گھڑی گھڑی اُٹھتی ہے۔ اور کوئی کالی کالی چیز اس میں ڈال دیتی ہے۔ زلفی رات بھر یہی تماشا دیکھتا رہا۔ جب صُبح ہونے میں تھوڑی رات باقی رہی۔ تو کسان کا لڑکا اُٹھا۔ اور ایک ہنڈیا میں آگ بھر کر دروازے کی طرف چلا۔ زلفی بھی اسی دروازے کی طرف ایک چھلانگ میں آیا۔ لڑکے نے جُوں ہی پٹ کھول کر نکلنا چاہا۔ زلفی نے بھپکی سُنائی۔ اور ہنڈیا اس کے ہاتھ سے چھین چلتا بنا۔ لڑکا پہلے تو ڈر کے مارے سہما کا سہما رہ گیا۔ جب ذرا ہوش آیا۔ تو دُہائی مچانے لگا۔ زلفی اتنی دیر میں کہیں کا کہیں پہنچا تھا ؛

جب بستی سے دور جنگل میں نکل آیا۔ تو جس طرح کسان کی بیوی کو آگ پھونکتے دیکھا تھا۔ خود بھی اسی طرح آگ پھونکنے لگا۔ اور دِل میں کہتا جاتا تھا۔ کہ گاؤں کے جانوروں کی شکل وصُورت مجھ سے بہت ملتی ہے۔ او ہو ارے رے رے۔ یہ پھُول تو مرچلے۔ کہیں ان کو بھُوک تو نہیں لگی۔ کچھ کھلانا چاہیئے۔ یہ کہہ ہنڈیا زمین پر رکھ بہُت سی سُوکھی پتیاں ٹہنیاں چُن کر آگ میں ڈال دیں۔ اور ہنڈیا اُٹھا بھاگنا شروع کیا۔ پہاڑ پر آدھی دُور چڑھا تھا۔ کہ ایک طرف سے سُورج نکلا۔ اور بگھیرا سامنے کھڑا

Taj Tahir Foundation

نظر آیا۔ اور ریشم کی سیاہ پوستین پر شبنم کی صاف شفاف بُوندیں ایسی جھمکتی تھیں۔ گویا بال بال موتی پروئے ہیں ٭

بگھیرا زلفی کو دیکھتے ہی بولا" رات کا قصّہ سُن لیا۔ چودھری سے شکار نہ ہو سکا۔ غول والے تو کل رات ہی کو اُس غریب کا فیصلہ کر دیتے۔ پر تمہارا ہونا بھی ضرور تھا۔ رات بھر بھیڑیوں نے تم کو ڈھونڈا ہے۔ سارا پہاڑ چھان مارا۔ پچھلے پہرے سے ذرا تھک کر بیٹھے ہیں"٭

زلفی۔ مَیں پہاڑ میں کیونکر ملتا۔ ڈھونڈنے کی ایسی کیا ضرورت تھی۔ اب آ جائیں۔ دیکھوں تو کیا کر لیتے ہیں۔ اتنا کہہ زلفی نے آگ کی ہنڈیا بگھیرے کے سامنے رکھ دی۔ اور کہنے لگا" اَور فرمائیے کیا حکم ہے؟"

بگھیرا ہنڈیا کو دیکھتے ہی دو قدم ہٹ کر بولا" شاباش میاں زُلفی شاباش۔ ایں کار از تُو آید و مرداں چُنیں کنند۔ لیکن ذرا اتنی احتیاط رہے۔ کہ یہ پھول کملا نہ جائیں۔ انسان تو ان پھُولوں میں درختوں کی سُوکھی شاخیں ڈالا کرتے ہیں۔ اور اُن کے پڑتے ہی شاخوں پر طرح طرح کے سُرخ پھُول اور پتّے نکل آتے ہیں۔ زلفی اتنے نہ جھُکو۔ تم کو تو بالکل ڈر نہیں لگتا؟"

زلفی۔ اس میں ڈرنے کی کون سی چیز ہے۔ مجھے تو اب یاد آیا۔ بہت دِنوں کا ذکر ہے۔ جب مَیں بھیڑیا نہ تھا۔ تو ایک دن ایسے ہی لال لال پھُولوں کے پاس پڑا کھیلتا تھا۔ اور بڑی بہار کے پھُول پتّے کھل رہے تھے ٭

زلفی بگھیرے سے رُخصت ہو صُبح سے شام تک آگ کی ہنڈیا کو بھٹ میں لئے بیٹھا رہا۔ کسی درخت کا ایک سُوکھا سا جھاڑ توڑ کر بھٹ میں گھسیٹ لاتا تھا۔ اور اسی کی چھال پتّیاں ٹہنیاں توڑ توڑ کر آگ میں ڈالتا تھا۔ جب شعلے اُونچے ہوتے تھے۔ تو خوب خوش ہو ہو کر کبھی قلابازیاں کھانے لگتا تھا۔ کبھی ناچتا تھا۔ کبھی کُودتا تھا۔ غرض سارے بھٹ کو سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ جب اسی کھیل میں دِن کٹ گیا۔ تو شام ہوتے ہی طباقی ٹڑے اینٹھتے ہوئے بھٹ کے دروازے پر آئے۔ اور مُنہ اُونچا کر کے پکارنے لگے" ابے او آدمی کے پلّے ہوت! ابے او ننگے دھڑنگے لونڈے ہوت! سنتا ہے۔ پنچوں میں تیری پُکار پڑی ہے۔ بس اُٹھ اور سیدھا ہو چل۔ نہیں تو ناک پر کاٹ کھاؤں گا"٭

زُلفی آگ سے کھیلنے میں خوش تو بیٹھا ہی تھا۔ گیدڑ کی آواز سُنتے ہی اس زور سے قہقہہ لگایا۔ کہ گیدڑ کے اوسان خطا

Taj Tahir Foundation

ہو گئے۔ اور دُم دبا کر اس زور سے بھاگا۔ کہ کسی کی نہ سُنی۔ زلفی بہتیرا چلایا۔ کہ اجی چودھری صاحب۔ سنئے تو ذرا دم تو لیجئے۔ مگر چودھری صاحب کو اس عرصہ میں پہلی چک پھیریاں یاد آ گئی تھیں۔ دوران سر کی شکایت ابھی باقی تھی۔ پسلیوں کی دُکھن اور دُم کی سوجن کو ابھی تک پورا آرام نہیں ہُوا تھا۔ اس حال میں کس کی سنتے تھے۔ غرض جب گھڑی بھر رات گئی۔ تو زلفی نے آگ کی ہنڈیا اُٹھائی۔ اور پنج پربت پر پہنچا۔ اب تک ہنسی کے مارے بے حال تھا۔ کہ رستے بھر قہقہے لگاتا پیٹ پکڑے پکڑے گیا۔

پنج پربت

پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر دیکھا۔ کہ آج چودھری چٹان پر نہیں ہے۔ بلکہ چٹان کے نیچے ایک طرف کو بہت دلگیر بیٹھا ہے۔ یہ گویا علامت تھی۔ کہ آج بھیڑیوں کی سرداری کا عہدہ خالی ہے سامنے شیر خاں دس بیس جوان بھیڑیوں کے جلو میں جو جھوٹا شکار کھا کھا کر خوب چکنے چپڑے ہو گئے تھے۔ ٹہل رہے ہیں۔ خوشامد کا بازار گرم ہے۔ "بجا و درست"۔ "جی حضور" اور "جو حکم" کی صدائیں ہیں۔ زلفی چپکے سے آگ کی ہنڈیا لئے ایک طرف بگھیرے

کے پہلو میں ہو بیٹھا۔ جب پوری پنچایت جُڑ لی۔ تو شیر خاں ٹہلتے ٹہلتے ایک جگہ ٹھہرے۔ اور ارادہ کیا۔ کہ پنچایت کے سامنے گفتگو کرے۔ تقدیر کی بات دیکھئے۔ کہ شیر اور سیونی کے آزاد بھیڑیوں کے سامنے بلا اجازت منہ سے بات نکالنے کی جرأت! آج کو چودھری میں دم ہوتا تو بھلا کسی کو اتنی ہمت ہو سکتی تھی؟

بگھیرے نے شیر کی نیت دیکھتے ہی زلفی کے کان میں کہا۔ "زلفی زلفی دیکھو۔ شیر کو اس مجمع میں گفتگو کا حق حاصل نہیں ہے۔ ذرا کھڑے ہو کر اتنا کہہ دو۔ کہ "شیر شیر کا بچہ نہیں ہے۔ بلکہ کُتّے کا جنا ہے۔ پھر دیکھو اس کا کیا حال ہوتا ہے"۔ زلفی فوراً کھڑا ہوا۔ اور بولا "اے آزاد بھیڑیو! کیا اب شیر کو اپنا سردار بناؤ گے۔ اگر ایسا قصد ہے تو حیف ہے تمہاری عقل پر"۔

شیر نے زلفی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور بولا "بھیڑیو! چونکہ اس وقت تک غول کا کوئی سردار مقرر نہیں ہوا ہے۔ اور مجھ سے اس جلسہ عام میں تقریر کرنے کی درخواست کی گئی ہے۔ اس لئے میں ......"

زلفی بیچ میں بول اُٹھا "وہ کون ہے جس نے تجھ سے ایسی درخواست کی ہے۔ کیا ہم اب بھیڑیوں سے گیدڑ ہو گئے ہیں"

Taj Tahir Foundation

کہ تجھ قصائی کی خوشامد کریں گے۔ غول کے سردار کو غول والے ہی انتخاب کریں گے۔ تُو دخل در معقولات دینے والا کون ہوتا ہے؟"

زنفی کی اس بات پر خوشامدی بھیڑیوں میں ہر طرف غُل پڑا۔ اور آوازیں آئیں "او آدمی کے بچے خاموش! او بے دُم کے جانور زبان بند کر! شیر خاں کو سب کچھ اختیار ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے"۔

یہ آوازیں سنتے ہی جتنے بھیڑیئے تھے سب چلّانے لگے۔ اور ایسا طوفانِ بے تمیزی برپا ہُوا۔ کہ برادری کے بڑے بُوڑھے مُنہ پھاڑ پھاڑ کر پچھلے پنجوں پر پُورے قد سے کھڑے ہو گئے اور چلّانے لگے "خاموش خاموش!" جب ذرا غل کم ہُوا۔ تو ایک نہایت مُسن واجب التّعظیم بھیڑیا کسی قدر تکلّف سے اُٹھا۔ اور بولا "بھائیو بھائیو! کُتّوں کی طرح لڑنے سے کیا حاصل۔ مرے بھیڑیئے کی بات پہلے سُن لو"۔

مرے بھیڑیئے سے مُراد چودھری تھا۔ کیونکہ بھیڑیوں میں جب تک کوئی سردار معزول ہو کر ہلاک نہیں کر دیا جاتا۔ اُس کو مرا بھیڑیا کہتے ہیں۔ اور حقیقت میں وُہ مرنے سے بدتر ہوتا ہے۔ دو چار

دن سے زیادہ اس کو کوئی نہیں جینے دیتا۔

اب چودھری نے اپنا بوڑھا سفید سر خاک مذلّت سے اُٹھا۔ اور بآوازِ حزیں کہنا شروع کیا "اے دشتِ سیونی کے آزاد بھیڑیو! میرا خطاب صرف تم ہی سے ہوتا۔ لیکن ان بے غیرتوں کو بھی اس میں شامل کروں۔ جو ننگِ قوم ہو کر شیر کے غلام اور چیلے بنے ہیں حقیقت میں وُہ اب بھیڑیئے نہیں رہے۔ بلکہ گیدڑوں سے بھی زیادہ ناپاک اور ذلیل ہیں۔ آج کچھ اوپر بارہ برس کا زمانہ ہوتا ہے۔ کہ اِس غول کی سرداری میرے ذمّہ رہی۔ جہاں تک میرے امکان میں تھا۔ اس مدّتِ دراز میں آپ صاحبوں میں سے کسی کو کسی طرح کی تکلیف یا گزند نہ پہنچنے دی۔ نہ کوئی جال میں گرفتار ہو کر مارا گیا۔ نہ کوئی شکنجے میں پھنس کر زخمی یا زندہ قید ہُوا۔ زیادہ عرصہ نہیں ہوتا۔ کہ جس وقت بارش کی قلّت سے شکار کی کشش ہوئی۔ تو بہتر سے بہتر مشورہ لے کر اور سہل سے سہل موقعے شکار کے تلاش کر کے کف دست صحراؤں اور دُشوار گذار وادیوں میں اسی غول کی قافلہ سالاری میں اپنی جان کو جان نہ سمجھا۔ اور کسی بھائی کو بُھوک کی تکلیف سے مرنے نہ دیا۔ اب البتّہ بڑھاپے نے معذور کر دیا۔ اور تمام عُمر میں کل رات کو یہ پہلا موقع تھا۔ کہ شکار پر چلا اور وار خالی گیا۔ آپ

Taj Tahir Foundation

سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔ کہ میری ضعیفی ہی اس ذلّت کا باعث نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ بھائیوں نے رُسوا کرنے کے لئے سازش کی۔ اور ایک ایسے ناکندہ جانور کو گھیر لائے۔ جو اس وقت تک کسی درندے کے حملے سے آشنا نہ تھا۔ خیر جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ اور ایک دن یہ ہی ہونا بھی تھا۔ اب بھائیوں کو اختیار ہے۔ کہ اسی پنچایت کے سامنے مجھے ہلاک کر دیں۔ ایک ایک بھائی اُٹھے اور مجھ سے لڑے یا وہ مجھے مار ڈالے۔ یا خود اپنی جان موت کے حوالے کرے۔ جو قاعدہ ہے اس پر عمل کرنا چاہیئے"؛

یہ متین و سنجیدہ تقریر سُن کر تو سب خاموش رہ گئے۔ معزول چودھری سے تنہا کشتی لڑ کر اس کو جان سے مارنے کی ہمّت کسی میں نہ تھی۔ جب کوئی بھیڑیا نہ اُٹھا۔ تو شیر خاں ایک دفعہ ہی مُنہ اونچا کر کے دہاڑے۔" بھائیو اس بُوڑھے پوپلے ناخن ٹوٹے احمق کا کیا ہے۔ آج نہ مرا کل مارا جائے گا۔ اصل فساد کی جڑ تو یہ آدمی کا پلا گول سر کا جانور ہے۔ اب یہ بہت جی لیا۔ کچھ آج سے نہیں دس برس سے ہم اس کے فراق میں دانت تیز کر رہے ہیں ؛

"اے آزاد بھیڑیو! اب اس آدم پرستی سے باز آؤ۔ برسوں سے اس منحوس نے جنگل کو ستا رکھا ہے۔ اب کچھ تامّل نہ کرو۔ اور اس

کو ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ سمجھ لو۔ کہ ان ہی پہاڑیوں میں بُود و باش اختیار کر کے رات دن طرح طرح کے شکار نہایت لذیذ اور فربہ تمہارے سامنے مار مار کر کھاؤں گا۔ اور حصّہ بخرہ تو درکنار اُلٹے پنجے سے چچوڑی ہڈّی تک تمہاری طرف نہ پھینکوں گا۔ یہ انسان ہے۔ اور انسان وُہ حیوان ہے۔ جس سے جنگل کے رہنے والوں کو بُغض للّٰہ رکھنا واجب بلکہ فرض ہے"؛

یہ سُن کر بہت سے پنچ بول اُٹھے" سچ تو ہے۔ اس بلا کو دُور بھی کرو۔ جہاں کا ہے وہیں جانے دو"؛

شیر خاں۔ واہ جہاں کا ہے وہیں جانے دو کی بھی خوب کہی چوروں کو گھر دکھا کر دھن لُٹوا دو۔ گنواروں کو دشمن بنا کر جنگل میں آئے دن قیامت برپا رکھو۔ تدبیر بھی نکالی۔ تو کیا خوب نکالی۔ ارے نادانو! سوائے اس کے کوئی تدبیر نہیں ہے۔ کہ اس کو میرے سپرد کر دو۔ ہزاروں دفعہ کہہ چکا ہوں۔ کہ انسان بُری بلا ہے۔ جس سے تم ایک پل آنکھ نہ ملا سکو۔ اس کو اب بھی اپنا دوست سمجھے جاؤ۔ تو بس رونا چاہیئے تمہاری اس دانائی پر ؛

چودھری نے پھر ہمّت کر کے سر اُٹھایا۔ اور بولا" بھیڑیو بھیڑیو! یاد رہے۔ یہ وُہ بھیڑیا ہے۔ جس نے ہماری قوم کے ایک نہایت معزز

Taj Tahir Foundation

خاندان میں پرورش پائی ہے۔ وہ ہمیشہ ہمارے دُکھ درد میں شریک رہا ہے۔ اس کی خدمتوں کو یاد رکھو۔ وہ زمانہ ابھی سے نہ بھولو۔ کہ چاروں طرف قحط کی پُکار تھی۔ خدا کی خدائی بھوکی مرتی تھی۔ اس وقت یہ ہی غریب انسان تھا۔ جو دُور دُور سے ہمارے لئے شکار گھیر کر لاتا تھا۔ اتنے احسان فراموش نہ بنو۔ ذرا اپنی اصل پر جاؤ۔ اور اس کا بھی خیال رکھو۔ کہ بدھ اور جوگ میں یہ لڑکا جنگل کے بڑے بڑے رشیوں سے بڑھ کر نکلا ہے۔ آج تک جنگل کے کسی قانون یا آئین کے خلاف اس سے کوئی بات عمل میں نہیں آئی"۔

چودھری کی تقریر ختم ہوتے ہی بگھیرا اُٹھا۔ اور نہایت متین اور شریفانہ لہجے میں یہ دو چار لفظ کہے۔ جن میں کسی قدر ترشی بھی تھی "اس کے علاوہ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ اس لڑکے کی جان بچانے کے لئے میَں نے کُل برادری کو کھانا دیا تھا۔ گو ایک جوان موٹا بیل ایسا انمول شکار نہیں ہے۔ کہ اس کو یاد دلایا جائے۔ لیکن ہمارا پاس عزت گوشۂ خاطر رہنا ضروری ہے۔ ورنہ آپ کو علم ہوگا۔ کہ بگھیروں کی قوم میں بھیڑیوں کا خون بہانا کوئی نئی بات نہیں ہے"۔

بھیڑیوں کی ایک پُوری صف کی صف بول اُٹھی "واہ حضرت واہ خوب۔ دس برس کی بات یاد دلائی۔ ایسے باسی گوشت کو یہاں

کوئی نہیں پُوچھتا۔ کہیں رات کو وُہی موٹا بیل بھوت بن کر آپ کی گردن پر تو سوار نہیں ہُوا تھا؟"

بگھیرا۔ یہ مجمع محلِ انصاف ہے۔ محلِ ظرافت نہیں۔ اگر آپ کو اپنے قول و قرار کا پاس نہیں تو لعنت ہے آپ کی آزادی پر۔ اور لعنت ہے آپ کے اس انصاف پر۔

شیر خاں۔ بس بس اس بدکلامی سے کیا حاصل۔ بگھیرے کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ کوئی آدم زاد ہم صحرائیوں کا ہم وطن و ہم قوم تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس لڑکے کا خون روا ہے۔ اور چونکہ وُہ ہمارا پُرانا شکار ہے۔ اس لئے اس کو مار کر کھانے کا حق سوائے ہمارے کسی کو حاصل نہیں ہے۔

چودھری نے ایک دفعہ پھر تکلیف کی۔ اور کہا "بھائیو۔ یاد رہے کہ یہ انسان ہمارا بھائی ہے۔ گو اس کا ہمارا خون ایک نہیں لیکن پھر بھی یہ لڑکا ہم کو اپنے ماں جائے سے بڑھ کر پیارا ہے۔ بس کیوں ایک بھائی کے خُون کے درپے ہوتے ہو؟ سُن لو۔ میَں اتنے دن جیا ہُوں۔ کہ اب زیادہ جینے کی تمنا نہیں۔ اس آخری وقت میں جو کچھ قسمت کا لکھا تھا وہ سب پُورا ہؤا۔ جو نہ دیکھا تھا وُہ دیکھا۔ اور جو نہ سُنا تھا وُہ سُنا۔ افسوس وُہ کون سا عیب ہے۔ جسے

Taj Tahir Foundation

تم نے کل کے لئے چھوڑا ہو۔ جھوٹا شکار کھانا اب تمہارا شیوہ ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ ہے۔ کہ شیر خاں کے بہکانے میں آکر روز شام کو گاؤں گاؤں گشت کرتے ہو۔ اور گھروں میں سے چھوٹے چھوٹے بچے نرم چارے کے لالچ میں اُٹھا لاتے ہو۔ اور مانس کا جی لے کر اپنا دھرم کھوتے ہو۔ سچ ہے یا تم سب مرجاتے۔ کہ یہ جنگل پاک ہو جاتا۔ یا میں غارت ہو جاتا۔ کہ یہ دن نہ دیکھتا لیکن تقدیر میں کس کو چارہ ہے۔ تمہاری ان حرکتوں کا یہ نتیجہ ہے۔ کہ میں تم کو نہایت بزدل سفلہ و کمینہ جانتا ہوں۔ اور اب تم ہی کمینوں سے میرا خطاب ہے۔ سُن لو۔ میرا مرنا یا مارنا یا مارا جانا اب یقینی ہے۔ زندگی چند روزہ ہے۔ اور جتنی ہے وہ بے لطف اگر یہ نہ ہوتا۔ تو میں خلافِ دستور تم سے لڑ کر اس بچے پر اپنی جان فدا کر دیتا۔ لیکن محض قوم کی عزت و ناموس کا خیال ہے۔ اس لئے میں کہتا ہوں۔ کہ اگر اس آدم زاد کے خون سے تم حذر کرو۔ تو میں اپنی جان سے موجود ہوں۔ جس بھائی کا جی چاہے آئے۔ اور مجھ کو فوراً ہلاک کر دے۔ ہرگز مقابلہ نہ کروں گا۔ اس میں کم سے کم تین بھائیوں کی جان بچ جائے گی۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر تم نے میری بات مان لی۔ تو ایک بے گناہ

کے خون ناحق سے بچ جاؤ گے۔ اور یہ وہ بھائی ہے جس کو اپنی زبان سے بھائی کہہ چکے ہو۔ اور جس کی جان کی قیمت قانون کے مطابق ہر شخص وصول کر چکا ہے"۔

بھیڑیئے اس تقریر کو خاک بھی نہ سمجھے۔ اور بولے "کچھ بھی ہو۔ ہم اب ایک پل اس آدمی کو اپنے غول میں رکھنے کے روادار نہیں"۔ اتنا کہہ بہت سے باغی بھیڑیئے شیر کے آس پاس اکٹھے ہونے لگے۔ شیر خاں کو دیدے لال کرتے کیا دیر لگتی تھی۔ جھٹ آنکھیں بدل زور زور سے دُم پھرانے لگے۔ کبھی چکر دے کر اِس پاؤں پر دے مارتے تھے۔ کبھی اُس پاؤں پر۔ کبھی آسمان کی طرف اُٹھا کر دُم کو آنکڑا بنا لیتے۔ اور پونچھ کا پھندنا پیشانی کا طرہ بن جاتا۔

بگھیرے نے جب یہ نوبت دیکھی۔ تو زُلفی کے کان میں کہا۔ "زُلفی اب بات تمہارے ہاتھ ہے۔ ہم سے اب سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑے گا۔ کہ لڑ کر اپنی جان کھو دیں۔ اور تمہاری جان بھی مفت میں جائے"۔

یہ سُنتے ہی زُلفی دہکتی آگ کی ہنڈیا لے کر اُٹھا۔ اور ایک انگڑائی لے کر تمام برادری کے سامنے جمائی لی۔ گو یہ علامت اس

Taj Tahir Foundation

بات کی تھی کہ ہم کو کسی کی کچھ پروا نہیں ہے۔ لیکن در اصل زلفی اس وقت غصّے سے بے تاب تھا۔ کیونکہ آج سے پہلے کبھی کسی بھیڑیے نے اپنی دشمنی کا حال اس کے مُنہ پر صاف صاف نہ کہا تھا۔ دو چار اور انگڑائیاں جمائیاں لینے کے بعد زُلفی نے آواز تیز کی۔ اور کہا۔

"بھیڑیو! کُتوں کی طرح لڑنے اور غصّہ سے پھول پھُول کر گدھوں کے برابر ہو جانے سے کچھ حاصل نہیں۔ آپ صاحبوں نے اس وقت بار بار جتلایا ہے۔ کہ مَیں آدمی ہُوں۔ اپنی طرف سے تو مَیں تم بھائیوں کے ساتھ مرتے دم تک بھیڑیا ہی رہتا۔ مگر تمہارے کہنے سے اب ہم بھی یہی کہتے ہیں۔ کہ ہاں ہم انسان ہیں۔ اور انسان بھی بُری طرح کے۔ آج سے کبھی تم کو بھُول کر بھی بھائی نہ کہیں گے۔ بلکہ" سگِ زرد برادرِ شغال" کہا کریں گے۔ تم کو جس قدر بھونکنا تھا۔ بھونک چُکے۔ اب ہم کو جو کچھ کہنا ہے وُہ بھی سُن لو۔ اور ذرا ادھر دیکھو۔ وہی انسان جس پر آج آپ دانتوں کو تیز اور پنجوں کو صیقل کرتے ہیں آپ کے لئے یہ کیا سوغات لایا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ کیسے سُرخ سُرخ انگارہ سے پھُول ہیں۔ یہ آج آپ پر نچھاور کئے جائینگے"۔

اتنا کہہ زُلفی نے آگ کی ہنڈیا زور سے پھرا کر بھیڑیوں کے بیچوں بیچ پھینک دی۔ ہنڈیا ٹوٹتے ہی انگارے پھیلے۔ اور

اُونچی گھاس میں جو بالکل سُوکھی کھڑی تھی۔ آگ لگ گئی۔ اور شعلے اُٹھنے لگے۔ شعلوں کے بُلند ہوتے ہی بھیڑیوں کے حواس یکلخت معطّل ہو گئے۔ اور ڈر کے مارے دُمیں سمیٹ کر پیچھے ہٹ بیٹھے۔

زلفی ہنڈیا کے ساتھ ہی ایک سُوکھے درخت کی لمبی سی شاخ مع ٹہنیوں اور پتّوں کے توڑ لایا تھا۔ جلتی گھاس میں اس جھاڑ کو سُلگا اُونچے ہاتھ سے سر پر پھراتا ہُوا بھیڑیوں کی طرف بڑھا۔

بگھیرا یہ دیکھتے ہی خوشی کے مارے ناچنے لگا۔ اور چلّا چلّا کر کہتا تھا "واہ بہادر واہ۔ تجھے کون سکھائے دیکھو۔ دیکھو چودھری کی جان بچا لینا۔ وہ تمہارا ہمیشہ خیر خواہ رہا ہے"۔

بُوڑھا چودھری جو آج تک اپنی جان بچانے کے لئے بھی کسی کے سامنے نہ گڑگڑایا تھا۔ کسی چیز سے خوف کرنا تو کس کو کہتے ہیں۔ شعلوں کو دیکھ کر ایسا بدحواس ہوا۔ کہ چیخیں مار مار کر رونے لگا۔

زلفی اس وقت عجیب شان میں تھا۔ سیاہ بھونرا سے بالوں کی لمبی لمبی لٹیں شانوں پر چھُٹی تھیں۔ جلتے جھاڑ کو جس سے غضب کے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ سر پر پھراتا ہُوا چاروں طرف چکّر کاٹ رہا تھا۔

Taj Tahir Foundation

اور سُرخ روشنی میں بھیڑیوں کی کالی کالی پرچھائیاں پہاڑوں اور چٹانوں پر اچھلتی کُودتی پھرتی تھیں۔ سچ پُوچھئے تو اس وقت کسی بھیڑئیے کے بدن میں خون باقی نہ تھا۔ بلکہ مشہور تو یہ ہے۔ کہ بہت سوں کی نبضیں بند ہو چلی تھیں، زُلفی اب ذرا ٹھہرا۔ اور چاروں طرف نظر ڈال کر بولا۔" پنچو اب دیکھ لیا۔ کہ بس نام کو بھیڑئیے ہو۔ اصل میں بازاری کُتوں سے بھی بدتر ہو۔ لو بس۔ اب ہم اپنے ہمجنسوں میں جاتے ہیں اگر اُنھوں نے ہم کو غیر نہ سمجھا۔ تو آج سے جنگل کا نام نہ لیں گے۔ اور یہ صُحبتیں دل سے بُھلا دیں گے۔ لیکن تمہاری طرح کسی دوست کو دغا نہ دیں گے۔ گو ہمارا تمہارا خون ایک نہ تھا۔ لیکن ہم تم کو بھائی کہہ چکے ہیں۔ اِس لئے اب بھی بھائی سمجھ کر تُمہارے ساتھ کبھی دغا نہ کرینگے۔ گو تم اِس لائق نہیں "۔

اتنا کہہ زلفی نے جلتی گھاس اور لکڑیوں میں دو چار ٹھوکریں ماریں۔ چنگاریاں چاروں طرف اُڑنے لگیں۔ اور زُلفی نے للکار کر کہا۔" بھیڑیوں میں ہمیشہ کو نااتّفاقی پیدا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے لیکن اس فساد کا جو اصل بانی ہے اُس کو بغیر سزا دیئے ہرگز نہ چھوڑیں گے "۔

یہ کہہ کر زلفی شیر خاں کی طرف بڑھا۔ بو پنجے اور دُم سمیٹے

گاؤتکیے کی صورت زمین پر پڑے تھے۔ اُلّو کی طرح آنکھیں جھپکا جھپکا کر شعلوں کو دیکھتے تھے۔ اور کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا ہو گیا۔ زُلفی کے بڑھتے ہی بگھیرا بھی کمک کو اُٹھا۔ زلفی نے شیر کے قریب پہنچ کر اس کی ٹھوڑی کے بال پکڑ کر کہا۔" بدتمیز۔ کھڑے ہو کر تعظیم دینی نہیں آتی۔ بہت آدمی آدمی جپ رہا ہے۔ اب آپ کے یہ چچا جان موجود ہیں۔ ان کو نہیں پہچانتے۔ بے ادب کھڑا ہو۔ اور جھک کر آداب بجا لا۔ نہیں تو سمجھ لیجئے۔ یہ آپ کی کاشانی مخمل کی نارنجی عبا اور یہ آپ کا دھاریوں والا پوستین جس پر آپ کو بڑا ناز ہے۔ ابھی جلا کر خاک کر دیا جائے گا "۔

شیر خاں کے دم پر اس وقت جو کچھ آبنی تھی۔ اس کا حال نہ پُوچھ۔ پنجوں اور دُم کا پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ کدھر ہیں۔ چہرے پر مُردنی چھائی تھی۔ دونوں کان کنپٹیوں پر اس طرح پڑے تھے گویا جان باقی نہیں۔ دیدے پہلے تو کچھ ٹمٹما تے بھی تھے۔ مگر اب نور بصارت گنگا پار چلا گیا تھا۔ کیونکہ شاخِ لالہ رنگ چہرۂ زعفرانی کے قریب روشن تھی۔ گویا بیچا کہ چرخ دکھایا جاتا تھا۔

زلفی نے شیر کا کان پکڑ بھیڑیوں سے خطاب کیا۔" بھیڑیو یہ وہی گائے بھینسوں کا بیری۔ آدمیوں کا جلاد۔ کمزور دل کا دُشمن

Taj Tahir Foundation

ہے۔ جس نے ہم کو مار کر کھانا چاہا تھا۔ اس کو بڑا قلق تھا۔ کہ ہم نے اس کی ڈاڑھ گرم نہ کی۔ اب دیکھ لو۔ جب انسان انسان کے جُون میں آتا ہے۔ تو کس طرح شیر تک کو ذلیل و خوار کر سکتا ہے۔ خبردار لنگڑے! کان ہلانا تو کیسا۔ اگر مونچھ تک پھڑکی۔ تو یہ جلتا چیلا تیرے حلق میں ڈال دُوں گا"۔

اِتنا کہتے ہی زُلفی نے دو چار جلتی لکڑیاں دھائیں دھائیں کر کے شیر خاں کی چندیا پر ٹکائیں۔ چندیا کے بال جُھرمُر ہو کر رہ گئے۔ پر یہ میرے شیر دم سادھے آنکھیں نیچی کئے اسی طرح پڑے۔ چراند سُونگھا کئے۔ اور مُنہ سے اُف تک نہ نِکالی۔

زُلفی۔ جا دُور ہو [illegible]دمی۔ لنگڑا تو تھا ہی۔ اب گنجا بھی ہو گیا۔ شیر کا ہے کو خاصا اوت بلاؤ معلوم ہوتا ہے۔ اور ابھی کیا ہے۔ جب ہم اس پہاڑ پر دوبارہ آئیں گے۔ تو تُمہاری کھال کی گٹھری ہمارے سر پر ہوگی۔ اور بھیڑیو تم بھی سمجھ لو۔ یہ بُڈھا چودھری آج سے آزاد ہے۔ جہاں چاہے رہے۔ اگر کسی نے اس کو ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھا۔ تو جہاں پاؤں گا زندہ زمین میں دفن کر دُوں گا۔ سُن لیا بے غیرتو بدتمیزو! اب کیوں یہاں بیٹھے گز گز بھر کی زبانیں نکالے ہانپ رہے ہو۔ جاؤ دُور ہو۔ اپنی صُورت نہ دِکھاؤ۔ ابھی سُنا نہیں؟" یہ کہہ زُلفی

نے جلتا جھاڑ سر سے اُونچا کیا۔ اور اس زور سے بنبھٹی پھراتا ہُوا دشمنوں کی طرف چلا۔ کہ بھیڑیوں میں سب طرف بھاگڑ پڑ گئی۔ جہاں جس کے سینگ سمائے ادھر کو بھاگا۔ یہ اُس پہ اور وہ اِس پر۔ کوئی یہاں گرا۔ تو کوئی وہاں۔ کوئی چٹان پر سے کُودا۔ تو کوئی گھاٹی میں لُڑھک گیا۔ یہ ایک پنجہ اُٹھائے تین ٹانگ سے بھاگا۔ تو وُہ دونوں پنجے اُٹھائے سر کے بل قلا کرتا نوک دُم ہُوا۔ ایک دوڑتے دوڑتے دانتوں میں دُم پکڑ چکر کھانے لگا۔ تو دُوسرا ٹوٹی کمر سے پچھلا دھڑ گھسیٹتا گھاس میں تلپٹ ہو گیا۔ کسی کا کان جلا تو کسی کی دم سُلگ اٹھی۔ کسی کی پیٹھ جُھلسی۔ تو کسی کی تھُتنی پر آبلے پڑے۔ غرض چاروں طرف ایک قیامت برپا ہو گئی۔ اور ایک پل میں سوائے دس پانچ بھیڑیوں کے جو زلفی کے حمایتی بن کر دُور جا بیٹھے تھے۔ جتنے بھیڑیئے تھے۔ روتے پیٹتے چیختے چلاتے دُہائی دیتے جدھر رستہ ملا بھاگ نکلے۔ اور سارے جنگل میں چراند پھُوٹ نکلی۔

جُدائی

جب اس ہلڑ میں شیر بھی ایک چٹان کی اوٹ میں لُڑھک کر کہیں کسی کالے منہ کے غار میں جان بچانے کو جا چُھپے۔ اور باغی

Taj Tahir Foundation

بھیڑیئے بھی بھاگ گئے۔ تو اب پہاڑ کی چوٹی پر بھیڑیوں کا معزول چودھری۔ بگھیرا اور زلفی بیٹھے رہ گئے۔ اس وقت زلفی کو اندر ہی اندر بے چینی سی معلوم ہوئی۔ اس سے پہلے اس طرح کی تکلیف اس کو کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ دو چار سسکیاں لے کر زار و قطار رونے لگا۔ اور چیخیں مار مار کر بگھیرے سے کہنے لگا "بھائی بگھیرے بھائی بگھیرے! بتاؤ تو سہی یہ مجھے کیا ہوا۔ جنگل سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ میری آنکھوں سے کیا نکلتا ہے۔ کہیں میں مرتا تو نہیں۔ بھائی بگھیرے بھائی بگھیرے ہو ہو ہو!"

بگھیرا بھی رونے لگا۔ اور سیاہ بوتل کے ٹکڑوں پر سے آنسوؤں کی دو موٹی موٹی بوندیں ڈھلک کر زمین پر گریں۔ پنجے سے آنکھیں پونچھ کر بولا۔ "نہیں پیارے نہیں۔ اس کو مرنا نہیں کہتے ہیں۔ یہ وہ آنسو ہیں جو ہر جاندار رو دیا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ اب تم سمجھدار ہو گئے۔ نادان بچے نہیں رہے۔ جنگل بے شک آج تم سے چھوٹتا ہے۔ اس کا صدمہ ہم سے زیادہ کس کو ہوگا۔ اتنے پریشان و مضطرب نہ ہو۔ ان آنسوؤں کو بہ جانے دو۔ پھر جی ٹھہر جائے گا۔"

اس سے پہلے زلفی نہ جانتا تھا۔ کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ پر آج تو وہ ایسا چھکا اور پھکا رویا۔ کہ جنگل میں ایسا کوئی نہ رویا ہوگا۔

جب رو دھو کر ذرا دل ٹھہرا تو بولا "لو بھائیو۔ اب ہم آدمیوں میں جاتے ہیں۔ تم سب کو جنگل کے سپرد کیا۔ پر پہلے اپنی ماں سے جس کا دودھ پیا ہے مل لوں۔"

یہ کہہ زلفی اُٹھا۔ اور بہت غم زدہ بھٹ کی طرف چلا۔ اور ماں کے گلے لگ کر خوب رویا۔ باوا جان بھیڑیئے نے آب دیدہ ہو کر گلے لگایا۔ اور زلفی نے رو رو کر ان کا سارا باران کوٹ بھگو دیا۔ چھوٹے بھائی بھیڑیوں نے جو سُنا۔ کہ بھیا جنگل سے چلا جائے گا۔ تو خوب چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ زلفی ایک ایک بھائی کو گلے لگا کر سمجھاتا تھا۔ اور ان سے بار بار کہتا تھا۔ کہ "بھائیو۔ دیکھو ہم کو بھول نہ جانا۔"

بھیڑیئے بھائی۔ واہ بھائی۔ ہم تم کو کیونکر بھول سکتے ہیں۔ آپ اس کا وعدہ کیجئے۔ کہ کبھی کبھی پہاڑ کے نیچے آیا کیجئے گا۔ پھر ہم بھٹ سے نکل کر آپ سے ملنے آیا کریں گے۔ اور رات کو سب مل کر کھیتوں میں خوب کھیلا کریں گے۔ کیوں بھائی۔ کیوں بھائی کیوں۔ اتنا کیوں روتے ہو۔ ہو ہو ہو!

ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں جاری تھیں۔ رو رو کر زلفی کے مُنہ سے اپنا مُنہ ملتی تھی۔ ماتھا چاٹ چاٹ کر پنجوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرتی تھی۔ اور کہتی تھی "بیٹا جاتے تو ہو۔ پر ہم

Taj Tahir Foundation

کو بھول نہ جانا۔ تمہارے باوا بڈھے ہو گئے ہیں۔ وہ اسی غم میں اپنا جی کھودیں گے۔ گو تم آدمی کے بچے تھے۔ پر جنگل جانتا ہے کہ تمہارے سامنے اپنے پیٹ کی مامتا کی بھی کچھ حقیقت نہ سمجھی۔ ہو ہُو ہُو!

زُلفی۔ نہیں اماں۔ میں ضرور ضرور آؤں گا۔ اور اب کے جب آؤں گا۔ تو اس شیر خاں مُوذی کی کھال کھینچ کر ساتھ لاؤں گا۔ اور چودھری والی چٹان پر اس کو بچھا کر بھیڑیوں کے سردار کو اس پر بٹھاؤں گا۔ اماں دیکھنا تمہارے پیچھے جنگل کے سودھندے لگے رہتے ہیں کہیں مجھکو بھول نہ جانا۔ نہیں تو میں مر جاؤں گا۔ لو اب میں جاتا ہُوں۔ جنگل والوں سے کہہ دینا۔ کہ زُلفی تم سب کو یاد کرتا ہُوا جنگل سے رخصت ہُوا۔ ہُو ہُو ہُو!

اس رونے پیٹنے اور رخصت ہونے میں صبح کے آثار مشرق سے ظاہر ہوئے۔ اور ہمارا زلفی افسردہ دل خستہ حال آنکھوں میں آنسو دل میں درد پہاڑ سے اُترا۔ تاکہ ان جانوروں میں بود و باش اختیار کرے۔ جن کو دُنیا میں انسان کے نام سے پُکارتے ہیں۔

پیارے لڑکو

جنگل کی پہلی کہانی ختم ہوئی۔ تم جی میں خفا ہو گے۔ کہ شیر کو جیتا چھوڑ دیا۔ اور زلفی کا حال آگے کچھ نہ سُنایا۔ ایک ایک سے پوچھو گے۔ کہ "پھر کیا ہوا" پھر کا حال تو یہ ہے۔ کہ زلفی خدا کے فضل سے اب تک زندہ سلامت ہے۔ جنگل میں اس۔ نے بڑے بڑے کام کیئے۔ ہر ایک کام کی ایک جُدا کہانی ہے۔ اگر اس کہانی کو پسند کیا۔ تو اَور کہانیاں بھی سُنائیں گے۔ کہانیاں سُنانے والے تو بہت ہیں۔ پر کوئی دل سے سُناتا ہے۔ کوئی اوپرے دل سے۔ اب تم ہی کہو یہ کہانی کیسی محنت سے لکھ کر تمہیں سُنائی ہے۔ جہاں کہیں سمجھ میں نہ آئے۔ مجھ پر خفا نہ ہونا۔ کسی بڑے سے مطلب پُوچھ لینا۔

Taj Tahir Foundation

جنگل کی دوسری کہانی

Taj Tahir Foundation

جنگل کی دُوسری کہانی

بھالُوجی کا پاٹھ شالہ

یہ تو آپ جنگل کی پہلی کہانی میں پڑھ چکے ہونگے - کہ بھیڑیوں کی بے وفائی سے بیزار ہو کر زلفی جنگل سے رخصت ہوا - مگر جو حال ہم اس کہانی میں لکھتے ہیں وہ اس سے کئی برس پہلے کا ہے ۔ یہ وُہ زمانہ ہے کہ زُلفی پورا چھ برس کا ہو کر ساتویں میں لگا ہے - اور بھالُوجی کے سامنے بیٹھا سبق سُنا رہا ہے ٭

بیٹھے بٹھائے شامت جو آئی تو بھُورے بندروں سے یارانہ جا گانٹھا ۔ ایک دِن بے خبر پڑا سوتا تھا - کہ بہت سے بندر آئے - اور موقع پا کر اس کو اُٹھا لے گئے ۔ آگے پڑھو گے - تو معلوم ہوگا کہ بھالُو

Taj Tahir Foundation

جی اور بگھیرے نے اس کے پیچھے کہاں کہاں کی خاک چھانی کیسی کیسی مصیبتیں اُٹھائیں۔ اور کس کس جتن سے اس کو بندروں کی قید سے چھڑا کر لائے ؀

ہاں تو بھالو جی جنگل کے پُرانے اُستاد اور اُن کے پڑھانے کا ڈھنگ بھی سب سے نرالا۔ کسی مندر یا شوالے میں تو آپ کا گذر کہاں ہوتا۔ بن کے بیچوں بیچ ایک پُرانے پیپل کی جڑ میں جا بیٹھتے۔ اور سامنے ہری ہری دُوب پر بھیڑیوں کے لونڈوں کا پاٹ شالہ جما لیتے تھے۔ پاٹ شالہ کاہے کو ہوتا تھا۔ بس صحرائی لڑکوں کا دنگل سمجھیے۔ خیر دنگل ہو یا پاٹ شالہ۔ اب تو جنگل میں یہی ایک جگہ رہ گئی تھی۔ جہاں سے درندوں کی اولاد لائق فائق ہو کر نکلتی تھی ؀

سبق تو خُدا جانے یہ لڑکے کیونکر یاد کرتے تھے۔ مگر کشتیاں لڑ کر غل مچانے کا تو یہ حال تھا۔ کہ پیڑوں پر سے شہد کی مکھیاں تک چھتّے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔ اور جب تک بھالو جی ایک آدھ لونڈے کو ٹھونک پیٹ کر تختہ نہ بنا ڈالتے۔ کوئی لڑکا دُم سمیٹ کر ادب سے نہ بیٹھتا تھا ؀

بی قہرن نے میاں سے مشورہ کر کے لڑکے کو ریچھ کے حوالے کر دیا تھا۔ ریچھ کو بھی زلفی کی طرف خاص توجّہ تھی۔ اس کی وجہ یہ

تھی۔ کہ بھیڑیوں کے لڑکے ایسے بدشوق اور کھلنڈرے ہوتے تھے۔ کہ اُستاد کا دل ان سے اُچاٹ رہنے لگا تھا۔ ان لڑکوں کو جہاں جنگل کی بھاکا میں دو چار اکھشر وہ بھی اپنی ٹولی کے یاد ہو گئے۔ پھر وہ کبھی مکتب کا رُخ نہ کرتے۔ پہاڑوں اور گھاٹیوں میں شکار کھیلتے پھرا کرتے ؀

ان کا بڑا سبق یہ تھا۔ کہ بھیڑیوں کو پہچاننے لگیں۔ پھر یہ سبق کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔ فقط یہ مضمون تھا ؎

چلتے ہیں دبے پاؤں نہیں چال میں آہٹ۔
آنکھیں گھُپ اندھیرے میں بھی ہوتی نہیں چوپٹ۔
پہچانتے ہیں جھٹ میں پڑے رُخ کو ہوا کے۔
کیا خُوب ہے کیا خوب ہے کانوں کی بناوٹ۔
ہیں کچلیاں اور دانت چمکدار نوکیلے۔
اس قوم کے گُن ہیں یہی پہچان لے جھٹ پٹ۔
ہے گیدڑوں کا چودھری البتّہ طباقی۔
گُتوّں پہ لپکتا ہے لگڑ بھگّا بھی سرپٹ۔

اس کے آگے پھر یہ لڑکے ایک حرف نہ یاد کرتے تھے۔ بھالو کو اس کا بڑا قلق رہتا تھا۔ مگر اب تو زلفی کی ذہانت دیکھ کر سب کچھ

Taj Tahir Foundation

بھول گیا تھا۔

زلفی اوّل تو آدمی کا بچّہ۔ پھر اُستاد کی خاص توجہ۔ جو سبق اس کو ملتا۔ ایسا لمبا چوڑا ہوتا۔ کہ یاد کرتے کرتے بالکل ہار جاتا۔ پھر بھی یاد کیئے بغیر نہ چھوڑتا۔

کبھی کبھی بگھیرا بھی شکار کھیلتا اُدھر آنکلتا تھا۔ اور یہ دیکھ کر کہ زُلفی بیٹھا اُستاد کو سبق سُنا رہا ہے۔ خوش ہوتا۔ اور کسی درخت سے چندیا کھجانے لگتا۔

جنگل کی بہت سی باتیں زُلفی نے سیکھ لی تھیں۔ پیڑ پر چڑھنے کی مشق تیرنے سے زیادہ۔ اور تیرنے کی مہارت دوڑنے سے بڑھکر ہوگئی تھی۔ اور بھاگنے کا تو یہ حال تھا۔ کہ ہرن بھی صُورت دیکھ کر چوکڑیاں بھُولتے تھے۔ مگر یہ سب باتیں تو زلفی کو جنگل کی پہلی کتاب ختم کرتے ہی آگئی تھیں۔ مشکل چیزوں کا وقت تو اب آیا تھا۔

کچھ دِنوں سے بھالُو نے جنگل کی پوتھی میں سے روکھ وِدّیا اور جل وِدّیا کے منتر شروع کرا دیئے تھے۔ اور تھوڑے ہی دِن میں شاگرد کو ایسا اُستاد بنا دیا۔ کہ پیڑ پر چڑھتے ہی ابھی ڈال پر پاؤں نہیں رکھتا ہے۔ اور بول اُٹھا۔ کہ شاخ مضبوط ہے یا کمزور۔

اُونچی مہال کو تاڑتے ہی مکّھیوں کو دم جھانسے دے کر کسی پھلواڑی کا پتہ بتا دینا اور ان کے جاتے ہی چھتّوں میں سے شہد نچوڑ چٹ کر جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جلتی دوپہر اور چلچلاتی دھُوپ میں پیڑوں پر چڑھ پتّوں کے جھُرمٹ میں بیٹھ کر سو جانا اور سونے کو جی نہ چاہا تو غریب چمگادڑ کو جگا کر ستانا روز کا مشغلہ تھا۔

"کہو بی دیدوں پھُوٹی! آج تمہارا جی کیسا ہے؟ خیر سے اُلٹی کیوں لٹکی ہو؟ کوئی چٹ پٹی کہانی سُناؤ۔ تو ہم بھی تمہارے ہی پاس اُلٹے لٹک رہیں۔"

چمگادڑ غریب جھنجلا کر کہتی۔ "دُر مُوئے میری آنکھیں دُکھتی ہیں" اور پھڑ پھڑ کرتی ڈال سے دو گز نیچے کہیں لٹک رہتی۔ اور زُلفی اتنی زور سے ہنستا کہ ایک بیری کی چڑیاں جھُر جھُر کر کے دُوسری بیری پر ایک سپاٹے میں پہنچ جاتیں۔ اور کچھ دیر غل مچا کر چُپ ہو جاتیں۔

پانی میں اُترنے سے پہلے پانی کے سانپوں اور کیچڑ کی جونکوں کو خبردار کرتا۔ کہ ہم آتے ہیں۔ اور مینڈکوں کو ڈانٹ بتاتا۔ کہ بڑوں کو دیکھ کر ٹرٹر فوراً بند کرنی چاہیے۔

جب تک ان باتوں کو کوئی بتائے نہیں۔ بھلا آپ سے آپ کس

Taj Tahir Foundation

کو آ سکتی ہیں ؟ اور ان کے بے سیکھے جنگل میں کون ایک گھڑی جی سکتا ہے ؟

اور پھر بن باسیوں کی نازک مزاجی کا حال کچھ جنگل والوں ہی سے پُوچھئے ۔ کہ جہاں کسی پردیسی جانور نے اچانک ان کی بستی میں قدم رکھا۔ اور یہ سمجھے کہ بس اب زندگی بے حلاوت ہوئی۔ سب ہی تو مل کر مسافر غریب پر ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ یوں تو سبق سب ہی مشکل تھے ۔ مگر اپنے دیس سے نکل کر پردیس میں بُھوک کے وقت شکار کی صدا لگانی زلفی کو بہت دنوں میں یاد ہوئی ۔

اوّل تو اپنا علاقہ چھوڑ کر دُوسرے کی زمین میں جانا اور پھر غیروں سے شکار کی اجازت مانگنی ۔ اور جب تک جواب نہ ملے ۔ بھُوکے بھیڑیوں کی لَے میں صدا لگانی " بھُوکے ہیں یارو ۔ کرلیں شکار ۔ عف عف " سخت مشکل کام تھا ۔ اگر کسی نے سُن لیا تو میاں پردیسی کو شکار کی اجازت مل جاتی تھی ۔ لیکن وُہ کوئی بڑا سا شکار تاکتے تھے تو فوراً پہاڑ کی چوٹی یا چٹان کی لگر سے جنگل کا کوئی چودھری للکار اٹھتا کہ خبردار بُھوک سے زیادہ ڈیل ڈول کا شکار اس بن میں مارا ۔ تو تم جانو گے ! بھیڑیوں کے اخلاق پر تو بھلا کس کی مجال ہے ۔ کہ مُنہ آئے ۔ لیکن یہ آواز پہاڑوں اور جنگلوں میں ایسی گونجتی پھرتی تھی

کہ جھاڑی کی اوٹ سے کوئی نہ کوئی شکار گھبرا کر نکل ہی پڑتا تھا ۔ اور میاں پردیسی کھاپی کر اپنا رستہ لیتے تھے ۔

بس اسی پر قیاس کر لیجئے ۔ کہ زلفی کو کتنی باتیں برزبان یاد کرنی پڑتی ہوں گی ۔ اور ایک ہی بات کو سَو سَو دفعہ رٹنے میں کیسی جان پر بنتی ہوگی ۔ سچ تو یہ ہے ۔ کہ بھالو جی بھی جو بات کہتے تھے ۔ بہت دور کی کہتے تھے ۔

ایک دن بگھیرے کے سامنے زلفی سبق میں کچھ بُھولا ۔ اور استاد کا چپت کھاتے ہی جھنجلا کر درخت پر جا چڑھا ۔ تو بھالو بگھیرے سے بولے " بزرگوں نے سچ کہا ہے ۔ کہ آدمی کا بچہ پھر آدمی کا بچہ ۔ دو ٹانگ کا بلّا ہے ۔ غصّہ تو دیکھو ہر وقت ناک پر دھرا رہتا ہے ۔ بیٹا چاہے خوش ہو کر پڑھو ۔ چاہے خفا ہو کر ۔ جنگل کی پوتھی جب تک پوری نہ یاد کر لو گے ۔ جنگل میں کوئی دن جینا مشکل ہے ۔ کیوں بھیّا بگھیرے سچ کہتا ہوں یا جُھوٹ ؟ بھیڑیئے کا پوت ہوتا ۔ تو خیر بُری بھلی طرح گزر بھی لیتا ۔ آدمی کا بچہ بھلا تم ہی بتاؤ جنگل میں کیا کر سکتا ہے ؟ اس کو بن کی پوتھی یاد کرانی تو لوہے کے چنے چبانے ہیں "

بگھیرا ۔ چنے چبانے ہوں یا بادام پھوڑنے ۔ آپ کے نزدیک تو سب شہد کے گھونٹ ہیں ۔ لیکن ذرا غور تو فرمایئے ۔ اس مختصر سے

Taj Tahir Foundation

سر میں یہ آپ کے مسائلِ صید و شکار اور یہ آپ کی ٹھائیں ٹھائیں کیونکر سما سکتی ہے ؟ بے چارے کا سر تو دیکھئے کیسا چھوٹا ہے ۔

بھالو - چھوٹے سر کو بڑا بنانا تو میرا کام نہیں ہے - جنگل میں کوئی چیز ایسی چھوٹی بتائیے جس کو گھر بیٹھے شکار کر کے گذارا کرنا آسان ہو - یہ تو جنگل ہے - اور جنگل بھی خونخواروں کا - جے پور کا عجائب گھر تو نہیں - کہ گھنٹی بجتے ہی چھلا چھلایا راتب کانٹے کی تول مل گیا اور کھا پی خس کی ٹٹی میں منہ ڈال سو رہے - میں تو خود اس کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتا ہوں - جب بالکل ہی جی نہیں لگاتا - تو آہستہ سے ایک آدھ چپتا لگا دیتا ہوں - وہ بھی بہت ہلکے ہاتھ سے ۔

بگھیرا - اللہ رے آپ کے ہلکے ہاتھ - پھولوں کی چھڑیاں بھی بھاری ہوتی ہیں - اب کیوں بھرے مکتب میں لونڈوں کے سامنے فضیحت کراتے ہو - گروجی خرانٹ ! یہ آپ کے ہاتھ ہیں یا لکڑی کی کھڑاؤں میں لوہے کی میخیں جڑی ہیں ؟ ان ہی ہلکے ہاتھوں نے تو غریب کا سارا منہ لہولہان کر دیا - اور آپ کے نزدیک گویا کوئی بات ہی نہیں واہ !

بھالو بگڑ کر بولے " منہ لہولہان کرنا کیسا - اگر ہم سر سے پاؤں تک خون کی بوٹی بنا دیں - تو بھی کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ۔

آج کا لہولہان ہونا اچھا یا کل کو جاہل کندۂ ناتراش رہ کر جنگل کی خاک پھانکتی اچھی ۔ کہنے کو تو ہو گئے - یہ نہ دیکھا - کہ کس طرح اس کے پیچھے اپنا خون پانی ایک کر رہا ہوں - جنگل کا ایک ایک منتر اس کو یاد کرا یا ہے ۔ اگر بھول نہ گیا - تو مجال ہے - کہ بھیڑیوں کو چھوڑ کر جنگل کا کوئی شکاری زمین کا چلنے والا ہو یا ہوا کا اڑنے والا اس کو بری آنکھ سے دیکھ سکے - جانوروں کے جس غول میں جائے گا فوراً اس کو پناہ دی جائے گی - پھر اگر اسی کی بھلائی کے لئے ایک آدھ طمانچہ لگا دیا - تو کون سے لعل جھڑ گئے ؟"

بگھیرا یہ تیز گفتگو سن کر جی میں شرمندہ سا ہو گیا - اور ہنسی میں ٹال کر بولا " گروجی قصور معاف ہو - تم گرو اور یہ لونڈے تمہارے چیلے - جس طرح چاہے سدھاؤ پڑھاؤ - پر ذرا اس کا خیال رہے کہ یہ غریب بچہ پیپل کی جڑ یا برگد کا ٹھنا نہیں ہے - جس پر کبھی آپ بھولے سے پنجے تیز کرنے لگیں - مر ہی کر تو رہ جائے گا - بے قدروں کی کون قدر کرے - ہم تو سدا کے جاہل اکھڑ ہیں - الف کے نام ڈھول اور بے کے نام دھپے کے سوا کچھ نہ آیا - مگر کان میں بات پڑی رہنی اچھی ہے - ذرا وہ مہا منتر ہم کو بھی تو سنوائیے - جو آپ نے اس چیلے کو سونپے ہیں ؟ یہ تو ظاہر ہے - کہ ہم کو ان کا کیا

Taj Tahir Foundation

کام پڑسکتا ہے جو اپاہجوں کے دستگیر ہوں وہ خود محتاج ہو کر دوسروں کے سامنے کیا ہاتھ پھیلائیں گے"۔ اور اتنا کہہ بگھیرے نے ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اور سمٹے ہوئے پنجے کو پھیلا کر انگلیاں چھدری کرلیں۔ اور انگلیوں کے سرے پر اودے اودے فولاد کے سے ڈھلے ہوئے ناخنوں کو جو لوہار کی کنٹیاں یا سنگ تراش کی چھینیاں معلوم ہوتے تھے غور سے دیکھ کر بولا۔" ان سے بڑھ کر جنگل کا کون سا منتر ہوگا؟ لیکن ذرا اس بچّے کے منہ سے وہ منتر ضرور سنوائیے"۔

بھالو نے تکلّف کے ساتھ گردن پھیر کر بہت اطمینان سے آواز دی۔" زلفی زلفی! بیٹا! بس غصّہ کو تھوک دو۔ اور ذرا ادھر چلے آؤ"۔

درخت پر سے کسی نے منہ چڑایا۔ اور آواز کی نقل اتاری" بلفی بلفی۔ ہاؤں ہاؤں۔ سر میں تو میرے اب تک تنتنے کاٹ رہے ہیں۔ اور انہوں نے پھر زلفی زلفی جپنا شروع کردیا۔ اب کیا مجھے جان سے مارو گے"؟ اور اس آواز کے آتے ہی ڈال پر سے کوئی چیز پھسلی۔ اور دھم سے زلفی زمین پر کودا۔ اور جدھر ریچھ بیٹھا تھا ادھر سے کترا کر بگھیرے کے پاس چلا آیا۔ اور کہنے لگا۔ "میں تو اپنے بگھیرے کے پاس آیا ہوں۔ کوئی تمہارے پاس

نہیں آیا۔ بھالو جی موٹے! بھالو جی موٹے"!!

ریچھ اپنے جی میں کُڑھ کر بولا۔" ان کے پاس آئے یا میرے پاس۔ بات ایک ہی ہے۔ اچھا جب جانیں کہ آج کا سبق فرفر سنا جاؤ"؟

زلفی۔ اچھا تو کس جانور کا منتر سنئے گا۔ جنگل کے تو بیسیوں منتر ہیں۔ وہ پوچھئے جو نہ آتا ہو؟

بھالو۔ واہ وا۔ شاباش۔ دو چار ہی باتیں سیکھ کر ایسے پھولے؟ سنتا ہے یار بگھیرے۔ اس زمانہ میں استاد کی کیا قدر ہوتی ہے؟ اور ایسے محسن کا احسان کیونکر مانا جاتا ہے؟ اسی جنگل میں لونڈے پڑھاتے عمر گذر گئی۔ مگر آج تک کسی بھیڑئیے کے لڑکے کو اتنی توفیق نہ ہوئی۔ کہ مکتب چھوڑے پیچھے پھر کبھی استاد کے سلام کو آتا۔ اچھا دانشمند ذرا درندے شکاریوں کا منتر تو سناؤ۔ بڑے لائق بنے پھرتے ہو"

زلفی کو سبق تو یاد ہی تھا۔ بہت خوش ہو کر استاد کے لہجے میں زور زور سے دھاڑنے لگا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا۔

جو خوں خوار ہو تم۔ تو خوں خوار ہیں ہم۔
کسی بات میں تم سے ہرگز نہیں کم +
ہمارا تمہارا ہے خوں ایک یارو +

نہ ہم تم کو ماریں نہ تم ہم کو مارو۔

بھالو دل میں بہت خوش ہوئے۔ باچھیں کھل گئیں۔ یہ نہیں معلوم اپنی لیاقت پر یا شاگرد کی تیزی پر۔ اور بولے "اچھا اب پنچھی پکھیرو کا بھی منتر سنا ڈالو"۔

زلفی نے دو چار تیز بولیاں بول کر اخیر میں بڑے زور سے زفیل دی۔ اور سیٹیاں بجا کر چپ ہو گیا۔

بھالو۔ اچھا اب سانپ کا منتر اور سنا دو۔ پھر چھٹی۔

زلفی نے اس سوال کے جواب میں کلے اور نتھنے پھلا کر ایسا پھنکارا مارا۔ کہ بگھیرا چار ہاتھ اچھل کر دور جا کھڑا ہوا۔ اور بے اختیار منہ نیچا کر کے گھاس میں ادھر ادھر سونگھنے لگا۔

اور اب چھٹی ملتے ہی زلفی زمین پر ہاتھ ٹیک۔ ہوا میں دو لتیاں جھاڑ۔ تالیاں بجاتا ہوا کود کر بگھیرے کی پیٹھ پر جا سوار ہوا۔ اور دونوں پاؤں ایک طرف کو ڈال کر جلدی جلدی لگا ایڑیاں چلانے اور بگھیرے کی پسلیوں پر ڈھول بجانے۔ اور بھالو کے ایسے ایسے منہ چڑانے۔ کہ جو جنگل والا ادھر سے نکلا۔ مارے ہنسی کے گھاس پر لوٹنے لگا۔ یا دم دبا کر بھاگ گیا۔

بھالو غصے کی صورت بنا کر پیار سے بولے "دیکھو دیکھو یہی

باتیں تو مار کھانے کی ہیں۔ ارے بے وقوف مینڈک! جب سمجھ آئیگی تو یاد کرے گا۔ کہ ہاں بھالو بھی کوئی تیرا بڑا بوڑھا تھا"۔

یہ کہہ کر ریچھ بگھیرے سے باتیں کرنے لگا۔ ادھر ادھر کی گپ شپ اور جنگل کی خیر خبر کے بعد بولا "یہ منتر جو آپ نے ابھی ابھی اس لڑکے کی زبان سے سنے نہایت مشکل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ گجپال ہاتھی کی توجہ سے جو اکثر مست رہتے ہیں۔ اور تن پر بھبوت ملے کھیتوں میں گنے کھایا کرتے ہیں۔ یہ علم مجھ تک پہنچا۔ بلکہ انہوں نے تو یہاں تک تکلیف گوارا کی۔ کہ ایک دن زلفی کو کندھے پر چڑھا کر سرپٹ جھیل تک لے گئے۔ اور وہاں اپنے پرانے دوست جل ناگ سے اس کو سانپ کا منتر یاد کرا کر لائے۔ میرا حال تو آپ جانتے ہی ہیں۔ کہ نہ گلا پایا ہے نہ گلپھڑے۔ پھنکاروں تو کیونکر پھنکاروں! اور جب کوئی چیز خود نہ آتی ہو۔ تو دوسرے کو کیا سکھائی جائے! غرض آپ کی توجہ سے اب یہ قہرن کا لاڈلا اتنا ہو گیا ہے۔ کہ جنگل کا کوئی اصیل جانور خواہ درندہ ہو یا پرندہ۔ چرنے والا ہو۔ یا رینگنے والا۔ اس کو گزند نہیں پہنچا سکتا۔ اور اب یہ لڑکا صحرا کے سب کھٹکوں سے بے جوکھ ہے"۔

بگھیرا۔ یوں فرمائیے۔ کہ بھیڑیوں کی برادری کے سوا جنگل

Taj Tahir Foundation

کے اَوْر خطروں سے محفوظ ہے۔ کیوں بھیّا زلفی۔ تم بھی کچھ سمجھتے ہو؟ ارے ارے پسلیاں کیوں توڑے ڈالتا ہے۔ بیٹھا ہے تو نچلا بیٹھ ناچنے کیوں لگا؟

جنگل کی اچھوت جاتی

بڑوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ زلفی کو بھی بیچ میں بولنا ضرور تھا۔ کبھی بگھیرے کی گردن میں ہاتھ ڈال کر شانہ کی کھال کھینچتا کبھی زور زور سے لاتیں مار کر چیختا۔ یہاں تک کہ بات کرنی دشوار کر دی۔ ناچار بھالُو نے کہا۔ "اچھا کہو کیا کہتے ہو"؟

زلفی چہک کر بولا۔ "گُرو جی۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ ہم کہاں گئے تھے؟ ابھی ابھی جب درخت پر چڑھے تھے۔ ہم نے تو اب پیڑ والوں سے یارانہ گانٹھا ہے۔ ایک بڑی ساری فوج تیار کی ہے۔ جنگل میں خوب ڈاکے ڈالیں گے۔ وہ ہماری فوج ہو گی اور ہم اس کے سردار"۔

بگھیرے نے گھُرک کر کہا۔ "ارے بے وقوف۔ یہ کیا بکتا ہے۔ چُپ رہ"۔

زلفی۔ ہاں ہاں۔ جب لڑنے بھڑنے سے چھُٹّی ملے گی۔ تو

پیڑوں پہ بیٹھ کر گرو جی کی چندیا پہ خوب کوڑا کرکٹ پھینکا کریں گے۔ مجھ سے اُن سے خوب پکا قرار ہو گیا ہے۔ گُرو جی سمجھے"؟

بھالو نے بھوں بھوں کر کے اُلٹے ہاتھ کا کفچہ زلفی کے جڑا۔ اور زلفی گرتے ہی لڑکنیاں کھا بگھیرے کے اگلے دونوں پاؤں کے بیچ میں لیٹے لیٹے کن انکھیوں سے دیکھنے لگا۔ کہ بھالُو جی تو سچ مُچ خفا ہو گئے۔

بھالو کو حقیقت میں غصّہ آ گیا تھا۔ کہنے لگا "زلفی میں تیرا مطلب سمجھا۔ نابکار تُو نے بندروں سے دوستی کی ہے۔ اور ان ہی کے پاس تُو گیا تھا۔ ہم تو یوں رات دن تیری سیوا کریں۔ اور تو یہ کرتوت سیکھے۔ اب بتا تیری کیا سزا ہے"؟

زلفی نے بھالُو کی طرف سے نظر ہٹا کر بگھیرے کی صُورت دیکھی کہ کہیں بھالُو کی طرح یہ بھی تو خفا نہیں ہو گئے۔ لیکن بگھیرے کی آنکھوں سے کچھ پتہ نہ چلا۔

بھالُو غصّے میں تو بھرے بیٹھے ہی تھے۔ زلفی کو پھر ڈانٹنا شروع کیا "میرا شاگرد ہو اور بندروں میں بیٹھے۔ اور بندر بھی بھورے بندر۔ لال مُنہ والے۔ جن کا نہ کوئی والی ہے نہ وارث جن میں کھانے کی احتیاط ہے نہ پینے کی۔ شرم شرم!!"

Taj Tahir Foundation

زلفی - اچھا تو پھر آپ نے مجھے مارا کیوں تھا؟ میں بھی رُوٹھ کر نکل گیا۔ تھوڑی دُور گیا تھا۔ کہ پیڑوں پر سے بہت سے بندر دھم دھم کر کے کُود پڑے - اور میرے پاس آتے ہی سب مجھ پر ترس کھانے لگے۔ آپ کو مجھ پر ترس آتا - تو بندر میرے پاس کیوں آتے ؟

اتنا کہتے ہی زلفی اُلٹی ہتھیلی سے ناک رگڑنے لگا۔ خدا معلوم اُستاد کی خفگی کا اثر تھا۔ یا کوئی مکھی لات مار کر اُڑ گئی تھی ۔

بھالو - ارے احمق! بندر اور کسی پر ترس کھائیں؟ جیٹھ بیساکھ کا سورج ٹھنڈا پڑ جائے سچ - پہاڑ سے رَوا ترے اور شور نہ ہو سچ - پر بندروں کو کسی پر ترس آئے جھوٹ - اور سو کا ایک جھوٹ آگے تو بتا کیا ہُوا؟

زلفی - پھر مجھے بھوکا دیکھ کر وہ جلدی جلدی گئے - اور بہت سارے کچے پکے پھل کلّوں میں بھر کر میرے پاس لائے - اور ڈنڈا ڈولی کر کے مجھے درختوں پر چڑھا لے گئے - اور ڈال ڈال پات پات کی سیر کرائی - اور میری صورت خوب غور سے دیکھ کر بولے۔ "اوہو۔ تم تو ہمارے بڑے پرانے یار ہو۔ یار کیسے بلکہ بھائی ہو۔ اتنے دن سے کہاں تھے؟ اچھا۔ اور یہ کیا! دُم کہاں چھوڑ آئے؟

دیکھو یار۔ یہ دُم کی کسر اچھی نہیں۔ خیر۔ اب آ گئے ہو تو ہم تم کو اپنا سردار بنائیں گے"۔

بھالو - ارے مُورکھ! بندروں کا کوئی سردار نہیں۔ اس ریوڑ کا ہانکنے والا آج تک جنگل میں پیدا ہُوا نہ ہو۔ وہ کیا جانیں سردار کس چڑیا کا نام ہے۔ سدا کے جھوٹے لپاٹیے ہیں"۔

زلفی - جھوٹے ہوں یا سچے۔ میری تو انہوں نے بہت خاطر کی۔ اور پھر ہلا وا دیا ہے۔ گردن تو آپ کو ہر بات پر ہلا دینی آتی ہے - جیسے میں بندروں میں گیا ہی نہ تھا۔ صورت شکل پوچھ لیجئے بھالو جی، وہ یہ کہتے تھے۔ جب سے ہماری چُٹیا اُڑی ہے چندیا میں فقط دو کان رہ گئے ہیں۔ اہا ہا! اور دیکھنا بھالو جی تم ذرا سُنو تو۔ چھوٹے چھوٹے گول گول دِیدے خوب پٹ پٹ جھپکاتے ہیں۔ اور صورت بڑی پیاری پیاری مٹکنا سی ہوتی ہے اور ادھر تو دیکھو۔ کبھی کبھی میری طرح پاؤں پاؤں چلنے لگتے ہیں۔ تو بڑی ہنسی آتی ہے۔ اور ایسے بڑے بڑے لکڑی سے ہاتھوں سے نہیں مارتے جیسے آپ کے ہیں۔ سارے دن نئے نئے کھیل نکال کر کھیلتے ہیں۔ اچھے میرے بھالو۔ اس پیڑ پر چڑھ جاؤں؟ دیکھو۔ وہ پتّوں کی اوٹ۔ اُدھر نہیں۔ وہاں تو کوّا بیٹھا ہے۔

Taj Tahir Foundation

ادھر دیکھو وہ جہاں ہری ہری ٹہنیاں ٹوٹی ہیں۔ دو تین پاس پاس بیٹھے دیدے مٹکا رہے ہیں۔ اچھے میرے بھالو۔ اس پیڑ پر چڑھ جاؤں ابھی کھیل کر چلا آؤں گا۔

بھالو بہت جھلا کر بولے "آدمی کے بچے سُن لے"۔ اور بھالو کی آواز ایسی ڈراؤنی تھی جیسے گرمی کی رات میں پچھلے پہر آندھی کا بادل گرجتا ہو۔ "سُن لے میں نے تجھ کو جنگل کی پوتھی سے بن کی بدیا سکھائی۔ اور تمام بن باسیوں کے بڑے بڑے منتر یاد کرائے۔ کہ کسی موذی جانور سے تجھ کو اذیت نہ پہنچے۔ بندروں کا کوئی منتر نہیں ہے ان کے خفقان کی دوا لقمان کو بھی یاد نہ تھی۔ وہ پیڑوں کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ہاں کسی قانون کا رواج نہیں۔ جات برادری سے باہر ہیں۔ کوئی ان کی بولی نہیں ہے۔ جو بات جس کے مُنہ سے سُنی۔ اسی کی نقل اُتارنے لگے۔ چور ہیں۔ اُچکے ہیں۔ اُٹھائی گیرے ہیں۔ درختوں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ اور پتوں کی اوٹ سے جنگل والوں کو تاکتے جھانکتے رہتے ہیں۔ ان کا طریق ہمارا طریق نہیں۔ ان کا کوئی ہادی و رہنما نہیں۔ کوئی بات ان کو کبھی یاد نہیں رہتی۔ رات دن ڈینگیں مارتے اور گپیں ہانکتے ہیں۔ خوب شیخیاں بگھار بگھار کر خیالی پلاؤ پکاتے ہیں۔ جنگل میں اپنی قوم سے بڑھ کر

کسی کو نہیں مانتے۔ اور سمجھتے ہیں کہ جب کوئی جنگل میں بڑا کام ہوگا وہ ان ہی کے پُرفن دماغ کا نتیجہ ہوگا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے۔ کہ اگر پیڑ پر سے ایک سڑا گولر بھی ٹپک پڑتا ہے۔ تو سب کے سب کلکاریاں مار کر ہنسنے لگتے ہیں۔ اور برسوں کے منصوبے ایک آن میں بھول جاتے ہیں۔ ہم جنگل کے بھلے جانوروں کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ جس گھاٹ وُہ پانی پئیں۔ اُس گھاٹ ہم پانی نہیں پیتے۔ جس رستے ان کے قافلے جائیں۔ اس رستے پہ ہم قدم نہیں دھرتے جہاں وہ مرتے ہیں۔ وہاں ہم کو مرنا بھی ناگوار ہوتا ہے۔ آج سے پہلے کبھی اس ناپاک قوم کا نام تو نے میری زبان سے سُنا تھا۔ تو ہی بتا"؟

زلفی بگھیرے کے پیروں میں پڑے پڑے ہی چپکے سے بولا "جی نہیں۔ کبھی نہیں"۔ اور زلفی کی آواز سب نے سن لی۔ کیونکہ بھالو کے خاموش ہوتے ہی جنگل میں ایسا سناٹا ہو گیا تھا۔ کہ تنکا بھی گرتا تو سب سن لیتے۔

بھالو نے پھر اسی طرح کڑک کر کہنا شروع کیا۔ "اور ہم وُہ ہیں کہ بندر کا خیال دل میں اور بندر کا ذکر زبان پر نہیں لاتے۔ وُہ بد ہیں بے شرم ہیں۔ ناپاک ہیں اور بے شمار ہیں۔ اور اگر ان کی

Taj Tahir Foundation

کوئی دلی تمنا ہے۔ تو بس یہ ہے۔ کہ جنگل والے ان کو دیکھیں اور سمجھنے لگیں۔ کہ یہ بھی کچھ ہیں، لیکن ہمارا طریق یہ ہے۔ اور یہ ہی طریق سب سے بہتر ہے۔ کہ ہم ان کی مطلق پروا نہیں کرتے، اتنا بھی نہیں جانتے کہ وہ کدھر بستے ہیں۔ پیڑوں پہ سے کوڑا کرکٹ پھینکنا تو کوئی بڑی بات نہیں۔ اگر وہ رات بھر ہمارے سروں پر نجاست بھی پھینکتے رہیں۔ تو بھی ہمارے بھاویں نہیں"۔

بھالو ابھی پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا۔ کہ اوپر سے کتاروں کی بوچھاڑ آئی۔ اور ایک دفعہ ہی آس پاس کے درختوں سے کھل نسنے کھنکارنے اور گلا صاف کرنے کا وہ غل مچا۔ کہ سب پریشان ہو گئے۔ اور ابھی یہ طوفانِ بے تمیزی کم نہ ہوا تھا۔ کہ پیڑوں میں بندروں کا بھونچال آیا، تو ڈال ڈال تو میں پات پات۔ ایک ایک بندر نے چقندر کی طرح مُنہ لال کر کے اس غضب کی دھمال شروع کی۔ کہ درختوں کی ڈالیں زمین پہ جھک جھک کر چوٹیوں کو سلام کرنے لگیں۔ بھالو بیٹھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بگھیرا بھی دم ہلانے لگا۔

بھالو نے زلفی کو جھنجوڑ کر کہا۔ "بس دیکھ لے اور سن لے اور سمجھ لے۔ اور کبھی نہ بھولنا۔ کہ جنگل کے شریف شکاریوں پہ بندر

حرام کیے گئے ہیں۔ اگر اب کبھی پھر ایسی حرکت کی۔ تو پنجوں سے کھال کھینچ کر دھوپ میں سوکھنے ڈال دوں گا"۔

بگھیرا۔ ہاں بھیا۔ پھر ایسی حرکت نہ کرنا۔ بات تو جب تھی۔ کہ اُستاد پہلے ہی سے شاگرد کو ہوشیار کر دیتے۔ اور یہ نوبت ہی نہ آتی۔

بھالو۔ مجھے خبر تھی۔ کہ یہ آپ کے لاڈلے درختوں کو نشیمن بنا کر بندروں کی صحبت اختیار کریں گے۔ اور بندر بھی بھورے بندر، توبہ توبہ کس کا نام لیا۔

بھالو چپ نہ ہوئے تھے۔ کہ درختوں پر سے کوڑے کرکٹ سوکھے پتوں اور سوکھی ٹہنیوں کا ایک بھتراؤ اور آ گیا، اب تو بھالو جھرجھری لے پوستین جھاڑ کھڑے ہو گئے۔ اور بگھیرے کو اشارہ کر زلفی کو ساتھ لے درختوں کے نیچے سے نکل میدان کے رستے پڑ لیے۔

بندروں کا چودھری

ریچھ نے بندروں کے احوال میں جو کچھ گفتگو کی تھی۔ وہ بے جا نہ تھی۔ بندر درختوں کے رہنے والے ہیں۔ اور درندوں

Taj Tahir Foundation

کی عادت ہے۔ کہ منہ اُٹھا کر بہت کم اُوپر دیکھتے ہیں + اس لئے نہ یہ اُن کا رستہ کاٹتے تھے نہ وُہ ان کا۔ لیکن بندروں میں خودنمائی کا شوق اِس قدر بڑھا ہؤا تھا۔ کہ راہ چلتے شکاریوں کو چھیڑتے + اگر بیمار بھیڑیا۔ تھکا ہارا ریچھ یا زخمی تیندوا زمین پر پڑا مل جاتا۔ تو پھر وہاں سے نہ ٹلتے۔ جھپٹ جھپٹ کر آتے اور مٹھیاں چُوم چُوم بیمار کو لانگ دُوسری طرف کُود جاتے۔ اور زخمی کے سرہانے ناچ رنگ کی محفلیں جما دیتے۔ اور ایسے بے سُرے گیت گا گا کر اور دُھرپد الاپ الاپ کر غل مچاتے۔ کہ کوئی نہ مرتا ہو تو مر جائے ٭

پیڑوں پر چڑھ کر رہ گیروں پر آوازے کستے۔ کہ اُوپر آؤ تو بتائیں۔ اس پر کوئی مُنہ نہ لگاتا تو کسی آم کی گٹھلی اور امرود کے چھلکے ہی پر لڑائیاں ٹھن جاتیں۔ اور ٹولیاں بنا کر کُشت و خون میں مصروف ہو جاتے۔ اور اپنے مُردوں کو بے گور و کفن درختوں کے نیچے پڑا چھوڑ جاتے۔ کہ جنگل والوں کی نظر پڑے اور وہ ان ناپاک مُردوں کو سُونگھ سُونگھ کر زبان سے ناک چاٹتے ہوئے بھاگ جائیں ٭

مگر باوجود ان زیادتیوں کے کوئی کان تک نہ ہلاتا تھا۔

اور پنچایتیں ہؤا کرتی تھیں۔ کہ کسی بڑے بُوڑھے بندر کو چودھری بنایا جائے۔ قانون و آئین جاری ہوں۔ نظم و نسق کا سلسلہ قائم ہو۔ جس پر سارا جنگل عش عش کرے ٭

لیکن کبھی یہ منصُوبے پُورے نہ ہوتے تھے۔ آج کی بات کل کو یاد رکھتے تو سب کچُھ ہوتا + اگر کسی کو کچھ خیال بھی رہا تو بزرگوں کی یہ مثل یاد کر کے کہ "جو آج بچارین بندر وہ کل بچارین بھالو" دِل کو تسلّی دے لیتے تھے ٭

غرض ہر بات میں تقدیم و ایجاد کا شرف بندروں ہی کو حاصل رہتا تھا۔ درندوں کی پہنچ سے باہر تھے۔ اور باہر کیوں نہ ہوتے جس صورت میں بندر کا ذکر کرنا تو کیسا بندر کا خیال تک ذہن میں لانا باعثِ شرم سمجھا گیا ہو۔ تو پھر صحرا کا وہ کون سا شکاری تھا جو اُن کی مزاج پُرسی کی ترکیب نکال کر اس رُسوائی کو اپنے سر لیتا ٭

اور یہی وجہ تھی۔ کہ جب زُلفی بندروں میں کچُھ دیر کھیل کر بھالو کے پاس گیا۔ اور بھالُو اس پر خفا ہؤا۔ تو یہ بندر دِل میں بہُت خوش ہوئے۔ کہ خیال کرنا کیسا۔ آج تو ہمارے قصّے بڑوں کی زبان پر ہیں۔ اور بجز اس کے کہ ادنےٰ باتیں اور خفیف

Taj Tahir Foundation

حرکتیں کر کے دل میں خوش ہو لیں۔ ان کی زندگی کا کوئی مقصد ہی نہ تھا۔ نہ اس کی پروا تھی۔ کہ کیا کرتے ہیں۔ نہ اس کا فکر تھا۔ کہ کیا ہوگا؟

چنانچہ ایک دن ایک صاحب ڈال پر بیٹھے جدھر کا ہاتھ تھا اُدھر ہی کی بغل کھجا رہے تھے۔ کہ دفعتہً دماغ میں ایک خفیف سا خیال پیدا ہوا۔ سمجھے کہ بات خوب نکالی۔ بلا تامل شاخ سے کود حلقہ احباب میں آتے ہی کہہ اُٹھے۔ کہ "اگر زلفی کو قید کر لیا جائے تو بڑا کام نکلے۔ سفر اور حضر دونوں میں آسائش ہو جائے"؛

اس پر یاران طریقت بولے۔ کہ "وُہ کیا آرام سوچا ہے۔ ہم پر بھی ظاہر ہونا چاہیئے"؛ تو فرمانے لگے "یہ لڑکا ہمارے پیڑوں میں سے ہری ہری ٹہنیاں توڑ کر لے جاتا ہے۔ اور ان کے پتے سونت کر کہیں اکیلا بیٹھا طرح طرح کی چیزیں بنایا کرتا ہے۔ اس کام کا سیکھنا ہمارے لئے ضروری ہے۔ سیکھنے کو تو ہم سب کچھ ایک دن میں سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس لڑکے کو پکڑنا اب ذرا ٹیڑھی کھیر ہے"؛

اس میں شک نہیں۔ کہ زلفی کا باپ کبھی کبھی جنگل میں لکڑیاں کاٹا کرتا تھا۔ اور اس کی ماں ٹوکریاں بنا کرتی تھی۔ یہ خون کا

اثر تھا۔ کہ زلفی آپ سے آپ ہری ٹہنیوں کو بُن کر چھوٹی چھوٹی ٹٹیاں بنا لیتا۔ اور جب جاڑے میں ہوا تیز چلتی۔ تو یہ غریب چھ برس کی جان کسی درخت کی آڑ میں ان ٹٹیوں کی چھوٹی سی جھونپڑی ڈال کر لیٹ رہتا؛

کہیں ان کم بخت بندروں نے بھی اس کو یہ کھیل کھیلتے دیکھ لیا تھا۔ اور اب اس بندر کی بات سنتے ہی سب کے سب دل میں سوچنے لگے۔ کہ آندھی۔ مینہ۔ جاڑے۔ پالے اور اولوں کے طوفان سے بچنے کے لئے واقعی اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں۔ کہ زلفی کو پکڑ لے چلیں۔ اور برسات سے پہلے پہلے پیڑوں پیڑوں چھاؤنیاں چھوڑ دیں؛

اب تو بندروں کو پورا یقین ہوگیا۔ کہ بس آج ہماری قوم کا سدا بہ اجلاس کامل منتخب ہوگیا۔ اور کوئی دن جاتا ہے۔ کہ ہم جنگل میں سب سے بڑھ کر لائق ہو جائینگے۔ اور ہماری لیاقت کا شہرہ ایسا عام ہوگا۔ کہ جنگل کے جتنے شکاری ہیں۔ سب ہی تو چندیا کے بل قلابازیاں کھاتے ہوئے دُور دُور سے ہمارے دربار میں حاضر ہوں گے۔ اور کمر سے دُمیں کھول کھول کر اپنا سر ہمارے قدموں میں ڈال دیں گے؛

غرض جب تھوڑی سی قیل قال اور بہت سی نوچ کھسوٹ کے بعد یہ مسئلہ قطعی طور پر طے ہوگیا۔ کہ زلفی کو گرفتار کر لینا چاہیئے۔ تو

Taj Tahir Foundation

اس پر عملدرآمد شروع ہُوا ۔

قصد اور عمل کے درمیان تامل کرنا تو بندروں کو آتا ہی نہ تھا۔ ہمیشہ ہتیلی پر سرسوں جما کرتی تھی + ادھر زلفی بھالو اور بگھیرے کے ساتھ ساتھ جارہا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر درختوں کی اوٹ چُپکے چپکے ان کے پیچھے ہولیا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوگئی۔ چیل نے انڈا چھوڑا ہی تھا۔ کہ شکاریوں کی نیند کا وقت آیا۔ زلفی استاد کی گھُرکیوں اور جھڑکیوں سے جی میں بہت شرمندہ تھا۔ اور یہ قسم کھاکر کہ اب بندروں میں کھیلنے نہ جاؤں گا۔ بھالو اور بگھیرے کے بیچ میں لیٹ کر آنکھیں بند کرتے ہی پٹ سے سوگیا ۔

زمین اور آسمان کے بیچ میں

اس کے بعد جو کچھ اس کو معلوم ہُوا یہ تھا۔ کہ کسی نے نہایت سخت اور سُوکھے ہاتھوں سے اس کے بازو پکڑ لئے ہیں۔ اور سارے بدن پر کوئی جھاڑُو سی چلا رہا ہے + آنکھ کھول کر دیکھا۔ تو خود درخت کی چوٹی پر ہے۔ اور نیچے بھالو نے جاگتے ہی ایسی دُہائی مچائی ہے۔ کہ سارے جنگل کو سر پہ اُٹھا لیا ہے۔ بگھیرا بھی کچلیاں نکال نکال کر ایک ایک درخت پر چڑھتا ہے اور پھسل پڑتا ہے۔ بندر پیڑوں میں دھما چوکڑیاں

مچا کر بھالو کی جے پکارتے ہیں "ناچ لے جمھورے ناچ لے بگھیرے واہ رے ہم واہ رے ہماری پھُرتی" + اس کے سوا کان پڑی آواز نہیں سُنائی دیتی۔ ایک بندر ڈال پر کود کر آتا ہے۔ اور بھالو کا مُنہ چڑا چڑا کر کہتا ہے "کیوں گرُوجی! اب تو سمجھے۔ کہ جنگل میں بندر بھی بستے ہیں" + دُوسرا دُور ہی سے خم ٹھونک کر بگھیرے کو بھپکی دیتا ہے "کیوں بھیّا صید افگن! آج تو تم بھی ہمارا لوہا مان گئے ہوگے ؛ کچلیاں کسی اَور کو دِکھانا۔ آج تو سارا جنگل ہماری اُستادی کا قائل ہے + اب تو آپ کے خیال شریف میں آیا۔ کہ یہ ناچیز بھی بڑی چیز ہیں۔ ان ہی کے دادا پیر نے لنکا پھونکی تھی" ۔

اب سنئیے کہ بَن کے اِن لٹیروں میں بھاگڑ پڑی۔ اور پیڑوں کے رن میں بندروں کی بھاگڑ معاذ اللہ! انسان کی طاقت نہیں کہ بیان کرسکے + ایک طبقہ زمین کا ہوتا ہے۔ جس کو بندروں کی کھوہ گاہ پورب سے پچھّم اور اُتّر سے دکن تک سمجھنا چاہئیے۔ جنگل میں درختوں کی چھتریاں ایک سے ایک ملی کوسوں تک چلی جاتی ہیں۔ اور ان میں بندروں نے بڑی بڑی سڑکیں۔ گلیاں۔ پگ ڈنڈیاں۔ ڈالوں کے جھُولے اور جھُولوں کے پُل زمین سے بیس بیس تیس تیس ہاتھ اونچے بنا رکھے ہیں۔ اور ان ہی کے رستوں رات ہو یا دن جب منزل پر

Taj Tahir Foundation

چلتے ہیں پہنچ جاتے ہیں۔ زمین پر قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔

زلفی کی کیفیت یہ تھی۔ کہ دو بڑے جگادری خرانٹ بندروں نے اپنا ایک ایک ہاتھ اس کی بغلوں میں دے رکھا تھا۔ وہ ان کے بیچ میں جھولتا درختوں کہیں کا کہیں گھسٹتا چلا جاتا تھا۔ اور دونوں بندر باوجود اس بوجھ کے ایک زقند میں دس دس بارہ بارہ ہاتھ ایک چوٹی سے دوسری چوٹی پر اُڑ جاتے تھے۔

زلفی حیران تھا۔ کہ کیا ماجرا ہے۔ اور چکر پر چکر اس کو آتے تھے۔ مگر پھر بچّہ تھا۔ رفتار کی تیزی دل میں امنگ پیدا کرتی تھی۔ اگر کہیں شاخوں کے ٹھنے سے زمین دکھائی دے جاتی تھی۔ تو خون خشک ہو جاتا تھا۔ لیکن بندر تھے کہ زقند پر زقند لگاتے تھے۔ خالی خولی ہوا میں جھٹکے کھاتے کھاتے زلفی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔

کبھی دونوں حوالدار پیڑوں پر اتنا اونچا چڑھ جاتے۔ کہ اوپر کی پتلی ٹہنیوں کو بوجھ کی سہار نہ رہتی۔ اور جب وہ ٹوٹنے کو ہوتیں۔ تو کسی نیچی ڈال کو پاؤں سے پکڑ قلہ کرتے ہوئے نیچے اتر آتے۔ اور کبھی اونچی ڈالوں کا ایک ایک ہاتھ سے سہارا لے اوپار جاتے۔ مگر کسی صورت سے زلفی کو نہ چھوڑتے تھے۔ کبھی کبھی زلفی کسی پیڑ کی پھننگ سے ہرے ہرے سنسان جنگل کا نظارہ اس طرح کرتا

تھا۔ جیسے کوئی ملاح جہاز کے مستول پر چڑھ کر کوسوں تک سمندر کی موجوں کو دیکھتا ہو۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پتّوں میں اس کا منہ چھپ جاتا۔ اور آناً فاناً میں بندر اس بلندی سے اتر کر نشیب میں پہنچ جاتے۔ کہ پھر زقند لگا کر دوسرے پیڑ کی چوٹی پر اُڑ جائیں۔ غرض اسی طرح پیڑوں پیڑوں بھاگتا دوڑتا جست پر جست اور زقند پر زقند لگاتا یہ شیطانی لشکر زلفی کو خدا جانے کہاں کا کہاں لے پہنچا۔

کئی دفعہ زلفی ڈرا۔ کہ بندر مجھے زمین پر پھینک دیں گے۔ اور ایک دفعہ تو وہ اسی خوف سے کچھ کسمسایا بھی۔ لیکن لڑکا ہوشیار تھا۔ فوراً سنبھل گیا۔ اور اسی طرح چپ چاپ تن بتقدیر دونوں کو بندروں کے حوالے کر اس مصیبت سے رہائی کی تدبیریں سوچنے لگا۔

پہلی بات یہ سمجھ میں آئی۔ کہ کسی طرح بھالو اور بگھیرے کو اپنے حال سے خبردار کرے۔ کیونکہ وہ سمجھتا تھا۔ کہ جس تیزی سے بندروں کا قافلہ اس وقت جا رہا ہے۔ اس حساب سے اس کے دوست بہت پیچھے رہ گئے ہوں گے۔ اس امید میں کہ بھالو کہیں دکھائی دے گا۔ زمین کی طرف دیکھنے کی کوشش فضول تھی۔ کیونکہ نیچے جس

Taj Tahir Foundation

چیز پر نظر پڑتی تھی۔ وہ درختوں کی ٹہنیاں تھیں۔ جو زمین کی مثل کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ سر پر البتہ آسمان تھا جس کے چاروں گوشوں پر زلفی نظر دوڑاتا تھا۔ ایک طرف سورج چمک رہا تھا باقی آسمان بالکل کورا پڑا تھا۔ اتنے میں دُور ایک نقطہ سا دکھائی دیا۔ سمجھ گیا۔ کہ ہو نہ ہو آسمان کی چیل ہے ۔

جنگل کی پہرہ دار چیل جوگنی

یہ جنگل کی مشہور پہرہ دارنی تھیں۔ چیل جل جوگنی اُن کا نام تھا۔ اور اس وقت اس فکر میں بلند پرواز تھیں۔ کہ دیکھوں آج جنگل میں کون مرتا ہے۔ زلفی کی نظر پڑتے ہی چیل کو بھی شبہ ہوا کہ آج بندروں نے کہیں ڈاکہ مارا ہے۔ ذرا اُتر کر دیکھنا چاہیئے۔ شاید کوئی چیز کھانے کے قابل ہو ۔

یہ سوچتے ہی شست باندھی اور جھٹ گُنڈے جوڑ سو گز نیچے اولے کی طرح آئی۔ اور چوٹیوں سے ابھی بہت اُونچی تھی۔ کہ پر پھیلا کر ہوا پر قائم ہوئی۔ اور اسی سطح پر چکر باندھ کر بڑی شان سے منڈلانے لگی ۔

دیکھا تو یہ دیکھا۔ کہ بندر ایک نئی صُورت کے جانور کو اُٹھا کر بھاگے ہیں۔ فوراً زفیل دے کر جنگل کو ہوشیار کرنا چاہا۔ کہ اِتنے میں زلفی نے پنچھیوں کا منتر پڑھ پھونکا۔ چیل متوجہ ہوئی۔ کہ کچھ اَور کہے تو سُنوں۔ مگر اس عرصہ میں درختوں نے زلفی کے مُنہ پر پردہ ڈال دیا چیل بھی شہباز کی خالہ تھیں۔ بازُو کے ایک اشارے میں رُخ بدل درختوں کے اوپر اوپر اسی رستے پڑلیں۔ جس رستے بندروں کا گارد قیدی کو لئے جاتا تھا ۔

اِتنے میں پتّوں کی اوٹ سے زلفی کا منہ نکلا۔ اور اُس نے پکار کر کہا "چیل! اچھی چیل! اُونچی چیل! تیری آنکھوں میں کاجل۔ میرا کھوج لیتی جا۔ پربت کے بگھیرے اور سیونی کے بھالُو کو میرا حال جا سُنا" ۔

چیل نے پُوچھا "کس کی طرف سے بٹیا۔ کس کی طرف سے؟"

چیل نے زلفی کا حال تو سُنا تھا۔ مگر صورت نہیں دیکھی تھی ۔

زلفی نے جواب دیا "میری طرف سے۔ میری طرف سے۔ زلفی میرا نام ہے۔ پیار سے مینڈک بھی کہتے ہیں اور بچّہ آدم کے نام سے جنگل میں مشہور ہوں۔ چیل۔ اچھی چیل۔ پیاری چیل۔ تیرے گھر میں پارس۔ میرا کھوج لیتی جا .... لیتی جا

Taj Tahir Foundation

...... بھالو ٭

یہ آواز چیل کے کانوں تک اڑتی سی پہنچی۔ کیونکہ بندر ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کی طرف اُڑ چکے تھے۔ لیکن چیل مطلب سمجھ گئی۔ اور جب دُم کی پتوار موڑ بازو مارتی ہوئی حلقہ باندھ ایسی اُونچی اُڑی کہ دیکھتے ہی دیکھتے تارا ہو گئی۔ اور جب اس بلندی پر پہنچی تو کچھ دیر قیام کیا۔ اور دونوں آنکھوں کی دُوربین لگا کر دیکھنے لگی۔ کہ درختوں کی شاخیں کس طرح ایک ہی سمت میں جھومتی چلی جاتی ہیں۔ اور دل میں کہنے لگی "یقینی یہ ہی کھوج ہے اُن لٹیروں کا جو زلفی کو لے کر بھاگے ہیں" ٭

کچھ دیر کے بعد دیکھا۔ تو درختوں میں حرکت نہیں رہی تھی۔ جی میں ہنس کر بولی "ارے واہ رے بے پَر کے بھگوڑو! تمہاری بھی وہی مثل ہے۔ کہ نو دن میں چلیں اڑھائی کوس۔ بڑی منزل ماری تو دس پانچ کوس چل کر کندھا ڈال دیا۔ کام دن بھر میں سَو۔ بچارو نبڑے ایک نہیں۔ اب تو وُہ جوانی کی نظر کہاں رہی۔ پہ ہماری منقار پر بھی دیدے ہیں تو دکھا دیں گے۔ کہ آج کے کئے کا بُہت بُرا پھل چکھو گے" بھالُو پھر بھالو بھُوٹان کا ریچھ ہے۔ فاختہ کی دُم نہیں، رہا بگھیرا تو اس کو کون نہیں جانتا۔ گردن میں زنجیر پڑ گئی ہو۔ تو خبر نہیں۔ لیکن

ہاتھوں میں چُوڑیاں پہنے نہیں دیکھا" ٭

چیل نے دِل ہی دل میں یہ باتیں کر کے دُم کے نیچے پنجے سمیٹ لئے۔ اور بازو چلا کر اُونچی اُڑنی شروع ہوئی، لیکن پھر کچھ سوچا۔ اور فوراً پروں کو تان کر چُپ چاپ منڈلانے لگی۔ اور یہ علامت تھی۔ کہ کسی بات کا سخت انتظار ہے ٭

اب بھالُو اور بگھیرے کا حال سُنئے۔ کہ اس عرصہ میں زُلفی کے پیچھے وہ بالکل دیوانے ہو گئے تھے۔ بگھیرا درختوں پر ایسا بے دریغ چڑھتا تھا۔ کہ اس سے پہلے کبھی اس کو اتنی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ لیکن کمزور شاخیں بوجھ سے ٹوٹ پڑتی تھیں۔ اور یہ دل میں حسرت اور پنجوں میں بکل چھال نوچتے ہوئے نیچے آن رہتے تھے۔ غصہ تو اپنی بے بسی اور بیکسی پر آتا تھا۔ اور ڈانٹتا تھا بیچارے بھالُو کو "ارے گرو۔ کمبل کے پوٹلے۔ پہلے ہی لونڈے کو کیوں نہ خبردار کر دیا۔ کہ آج اس مُصیبت میں نہ پڑتا جب۔ تجھ سے اتنا بھی نہ بتایا گیا۔ تو تُو اس غریب کو پٹیا کیوں کرتا تھا"؟

بھالُو کو بات سننے یا جواب دینے کا ہوش کہاں تھا؟ روتا پیٹتا۔ گرتا پڑتا۔ لوٹتا لڑھکتا چلا جاتا تھا۔ کہ شاید بندروں کو پکڑ لے۔ دوڑتے دوڑتے دم بھول گیا تھا۔ اور پیٹ کا پانی اس طرح بولتا تھا۔ جیسے

ستّے کی ادھ بھری پکھال۔ بگھیرا جب کوئی بات پُوچھتا۔ ہانپتا کانپتا یہی جواب دیتا۔ کہ "چل چلا چل بھیّا۔ چلا چل۔ ابھی کچھ نہیں گیا ہے"۔

بگھیرا۔ جانے کو اب رہا کیا ہے۔ جس چال سے آپ جا رہے ہیں۔ اس چال سے تو لنگڑے ٹٹّو کو بھی پسینہ نہیں آتا۔ مگر آپ تھوڑی دیر میں پانی ہو کر بہ جائیں گے۔ لونڈوں کو پیٹنا ہی سیکھا تھا یا کچھ اَور بھی آتا ہے؟ گرو گھنٹال۔ اگر آدھ کوس بھی اس طرح اَور سڑک پہ بیلن پھیرتے چلے تو پیٹ پھٹ کر اوجھ نکل پڑے گا۔ ذرا بیٹھ کر سستا لو۔ اور سوچ لو کہ کیا کرنا ہے۔ بندروں کا پیچھا نہ تم سے ہوگا۔ اور نہ پیچھا کرنے سے کچھ حاصل۔ اور جو اُن تک پہنچ بھی گئے۔ اور تمہاری صورت دیکھتے ہی اُنہوں نے لونڈے کو نیچے پھینک دیا۔ تو آپ کی یہ برسوں کی کرائی کمائی سب خاک میں مل جائے گی۔

بھالُو بگھیرے کے مُنہ سے یہ فال سُنتے ہی بکھر گئے۔ اور لگے چلّانے "ارے باپ رے باپ۔ کون جانتا ہے۔ کہ اب تک گرا کر ہڈّیاں چُورا نہ کر دی ہوں گی۔ ارے میرے زلفی۔ میرے لال۔ بندروں نے تجھے کب جیتا چھوڑا ہوگا؟ ارے کیا کروں؟ جنگل والو تم ہی کچھ بتاؤ۔ سانپ کے مُنہ میں چھچھوندر۔ نگلوں تو اوندھا، اُگلوں تو کوڑھی۔ تھرن کو کیا مُنہ دِکھاؤں گا؟ کوئی طباقی ہی سے کہہ دو۔

کُنبے والوں کو لا کر مُجھے جیتا نگل جائے۔ مہال کی مکّھیو۔ تُم ہی آ کر قصّہ پاک کر دو۔ زلفی میرے کندھوں کے سوار۔ اِس دن کی کسے خبر تھی؟ تیرا سر تو روز کُچلوں۔ اور بندروں سے تجھے خبردار نہ کروں۔ اور جو تم نے بھالُو کے ساتھ جنگل کے منتر بھی بھلا دِئے۔ تو اب جنگل میں تمہارا پُوچھنے والا کون رہا۔

بھالُو غریب روتا تھا۔ اور کنپٹیوں کو پنجوں سے پکڑ زمین پر لوٹتا تھا۔

بگھیرا یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اور بولا "ہائیں ہائیں گرُو جی اتنی بدحواسی! ذرا ہمّت سے کام لو۔ یُوں خارپُشت کی طرح گولا بن کر لُڑھکنے سے کیا حاصل؟ جنگل والے کیا کہتے ہونگے؟"

بھالُو۔ جس کا جو جی چاہے سو کہے۔ اب مجھے کسی سے کیا زُلفی جیتا ہوتا تو سب کُچھ تھا۔

بگھیرا۔ اگر یُوں ہی تماشا دیکھنے کے لئے مار ڈالا ہو۔ تو اس کی تو کہتا نہیں۔ باقی کچھ فکر نہ کرو۔ لڑکا بہُت عقلمند اور ہوشیار ہے اور اس کی آنکھ میں ایسی قوت ہے۔ کہ کوئی جانور اس کو ہلاک نہیں کر سکتا۔ لیکن پھر بھی بندر کا قیدی اور بندر کا زخم برابر ہیں۔ مگر اس کا کیا علاج! وُہ پیڑوں کے رہنے والے۔ ہم زمین کی خاک

چھانٹنے والے۔ تدبیر ہو تو کیا ہو؟"

یہ کہہ کر بگھیرا دُم سے جھاڑو دے زمین پر بیٹھ گیا۔ اور فکر سے دونوں پنجے چاٹنے لگا۔

بگھیرے کے کہنے سننے سے ریچھ کے حواس کسی قدر درست ہوئے۔ اور یا تو خاک پر پڑا لوٹ رہا تھا۔ یا ہلکی سی جُھرجُھری لے کھڑا ہو گیا۔ مگر نہایت زار و نزار۔ اور بگھیرے سے کہنے لگا "سچ ہے۔ جب بُرا وقت آتا ہے۔ تو جانور نرا ریچھ رہ جاتا ہے۔ بلکہ گھسیارے کا موٹا جھوٹا کمبل کُھرپا نہ جالی۔ پنجوں سے جڑیں کھودو اور کھاؤ۔ اب کچھ یاد آتا ہے۔ کہ گجپال ہاتھی نے ایک دن کہیں کی کہاوت کہی تھی۔ کہ "ہر فرعونے را موسیٰ"۔ بندروں کی اکسیر اژدھے کے پاس ہے۔ وہ بھی ان کی مومیائی خوب تیار کرتا ہے سمجھے بھی کون سا اژدھا؟ وُہ ہی بابا جی اجگر جو کالے پہاڑ والے کر کے بھی مشہور ہیں۔ درختوں پہ چڑھنے کی مہارت ان کو بندروں سے بڑھکر ہے۔ اور جب تک رات کو مُنہ میٹھا کرنے کے لئے دو چار بندریوں کے بچے نوش نہیں کر لیتے۔ کمر سیدھی نہیں کرتے۔ اور ان کے نام کی وُہ تاثیر ہے۔ کہ اگر کوئی جھوٹ مُوٹ بھی کہہ دے کہ "وُہ اژدھا آیا"، تو ان بے ایمان بندروں کی شریر دُمیں تک

ٹھنڈی پڑ جاتی ہیں۔ بس اب یہی مناسب ہے۔ کہ اژدھے سے چل کر فریاد کریں"۔

بگھیرا۔ اجی اژدھا کیا کر لے گا۔ مفت میں اوقات خراب ہو گی۔ وہ خاک کا لوٹنے والا۔ بن پاؤں کا روگی۔ کوئی ہمارے پنتھ کا ہے۔ کہ اِس آڑے وقت میں کام آئے گا؟ اور پھر اس کی نظر خدا کی پناہ! نہایت خوفناک ہے۔

بھالو۔ بُڑھاپے میں کس کی نظر رہتی ہے؟ اب وُہ ہوش جوانی کہاں۔ البتہ چُستی و چالاکی بدستور قائم ہے۔ اور یہ کیسا ضعف ہے۔ کہ بارہ مہینے بُھوکا رہتا ہے۔ بھیّا بگھیرے جو کچھ ہو۔ اب تو اژدھے کے پاس چلنا ضرور ہے۔ اس وقت اَور کیا ہو سکتا ہے۔ دو چار پہاڑی بکریاں ہی بھینٹ چڑھا دیں گے کسی طرح کام تو نکلے۔

بگھیرا۔ اور جو وُہ سوتا ہُوا؟ سُنا ہے ناشتہ کرتے ہی سو جاتا ہے۔ اور پورے ایک مہینے تک پڑا سویا کرتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت خواب نوشیں میں ہو۔ اور جو ہمارے کہنے سُننے سے اُٹھا بھی۔ اور کہہ دیا۔ کہ ہم تمہاری نذر قبول نہیں کرتے ہمیں بکریوں کی کمی نہیں۔ تو پھر کیا؟ اپنا سا مُنہ لے کر واپس آنا

پڑے گا ؎

بگھیرے نے یہ خواہ مخواہ کے اعتراض اس وجہ سے پیدا کیئے تھے ۔ کہ اژدھے کے حالات سے واقف نہ تھا ۔ اور ناواقفیت کی حالت میں حیوان کو حیوان سے جس قدر بدگمانی ہو کم ہے ؎

بھالُو ۔ واہ تم بھی پُرانے شکاری ہو کر کیسی بات کہتے ہو ۔ انکار کیا تو کیا ہے ؟ اب ایسے بھی ہم بالکل گئے گُذرے نہیں ہیں ۔ یُوں نہ سمجھا ۔ تو اَور طرح پہ سمجھانے کو موجود ہیں ؎

یہ کہہ کر بھالو نے ایک قدم آگے بڑھایا ۔ اور اس واجب التعظیم بھُوری پوستین کا شانہ جو آج مٹّی میں لتھڑ کر بُہت ڈھلک گیا تھا ۔ بگھیرے کے کندھے سے لڑا کر کہا " چلتا بھی ہے میرے یار ۔ یا یہیں کھڑا ٹالے بالے بتائے جائے گا " ؎

کندھوں کے لڑتے ہی دونوں جوان باباجی اجگر کے استھان کا ارادہ کر کے چل پڑے ؎

باباجی اَجگر کے دوارے

کالے پہاڑ پر پہنچتے ہی دُور سے دیکھا ۔ کہ باباجی ابھی ابھی موکھے سے نکل کر چٹان کے چھجّے پر دھُوپ کھانے نکلے ہیں ۔

مدّت سے چلّہ کھینچ رہے تھے ۔ آج ہی کینچلی بدل کر باہر آئے ہیں کہ ذرا اُجالے میں بیٹھ کر نیا رُوپ لیں ۔ پھن سے لے کر دُم کی نوک تک ایک اِنچ کم نہ زیادہ ۔ پُورے تیس فٹ کے تھے ۔ جس کے نمبری حساب سے دس گز ہوئے ۔ وزن کا حساب لگانا مشکل ہے مگر پیٹ پر سے اتنے موٹے تھے ۔ کہ اچھّے خاصے جوان بندر کی کولی میں مشکل سے آتے ۔ اب رہا رنگ رُوپ ۔ تو بس اس کا حال نہ پوچھیئے ۔ سُنہری زمین پہ رُوپلے کا باریک ماہی جال ۔ اور اس پہ سیاہ زنجیرے میں چمپئی گُل بُوٹے ڈھلتے سُورج کی کرن میں پہاڑ پہ بجلیاں کوندا رہے تھے ۔ اور یہ کالے پہاڑ والے جوبن کی ترنگ میں اینٹھ اینٹھ کر بیس ہاتھ کا موٹا رسّہ بڑی آب و تاب سے بٹ رہے تھے بل پہ بل کھا کر طرح طرح کی کنڈلیاں مارتے تھے ۔ مگر کسی نشست پر قرار نہ تھا ۔ کبھی لہر میں آ کر اپنے ہی ڈھیر پہ قدِ آدم بُلند ہو جاتے اور محض سُستی اُتارنے کے لیئے دو دو چار چار گز پیچھے ہٹ کر پھَنّ پھُرد پر پھن کی موگریاں مارتے ۔ اور جب ناشتہ کا خیال آتا ۔ تو جلدی جلدی زبان نکال کر ہونٹ چاٹنے لگتے تھے ؎

اژدھے کو دُور سے دیکھتے ہی بھالو نے کہا " بھیّا بھگیرے شُکر کرو ۔ کہ ابھی تک کھانے کو کچھ نہیں ملا ہے ۔ ذرا ہوشیار رہنا ۔

Taj Tahir Foundation

کینچلی بدل کر نکلتے ہیں تو ذرا سُوجھتا کم ہے۔ اور چوٹ کرنے میں بھی جلدی کر جاتے ہیں"؛

اژدھا بھی ایک قسم کا سانپ ہے۔ لیکن زہریلے سانپوں میں اس کا شمار نہیں۔ زہریلوں کا ہُنر اُن کے دانت ہیں اور زہر کے چھالے۔ اور اژدہوں کی قوت بدن کے جوڑوں میں ہے۔ کہ جس جانور پر لپٹ کر چھپّن جوڑ کس دئے۔ پھر اس مرحوم کا ذکر صرف کہانیوں میں رہ جاتا ہے ؛

بھالُو نے دُور ہی سے اژدہے کو سلام کیا۔ اور پُٹّھوں کے بل ادب سے ہو بیٹھا۔ ثقلِ سماعت یعنی اُونچا سُننے کا مرض جو اژدہوں کی نسل میں مدّت سے چلا آتا ہے۔ باباجی میں بھی موجود تھا۔ کسی کا سلام سُنتے تو جواب بھی دیتے۔ لیکن کُچھ آہٹ پاکر پُورے اٹھارہ ہاتھ تہ ہو گئے۔ اور کنڈلی پر گز بھر سیدھے ہو کر گردن پیچھے کو ڈال پھن آگے کو بڑھا لیا۔ کہ اتفاق ہی تو ہے۔ خدا جانے کیا موقع پیش آئے ؛

اور اب چُندھی چندھی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔ "سلام بھیّا سلام! آہا بھالُو ہیں۔ سیونی والے؛ کہئے کیسے آنا ہُوا؟ اور اچھا آپ بھی ہیں بگھیرے پربت والے؛ خوش رہو

foundation

شکاری خوش رہو۔ پیٹ تو اس وقت ایک نہ ایک کا ضرور خالی ہوگا۔ کہو کچھ شکار وکار کے بچن بھی نکالے؟ کوئی بھیڑ۔ بکری۔ ہرنی۔ منڈائن جنگل میں کچھ ہے بھی۔ یا سارا بن سُونا پڑا ہے؟ یہاں تو اُوپر سے لیکر نیچے تک ایسے خالی پڑے ہیں جیسا اندھا کنواں"۔

بھالو۔ جی ہاں۔ ہم بھی شکار ہی کھیلتے کھیلتے ادھر آنکلے ہیں۔ بات بچاکر کہنی بھی جھوٹ میں داخل ہے۔ مگر ریچھ اژدھے کے مزاج سے واقف تھا۔ کہ ڈیل ڈول زیادہ رکھتے ہیں۔ جلدی میں ان سے کوئی کام نہیں نکل سکتا۔

اژدھا۔ اچھا گرُو کو بھی شکار کا شوق ہوگیا؟ ساتھ تو اچھا ہے۔ پھر کہو تو ہم بھی چل پڑیں؟ تم جوانوں کا کیا ہے۔ اس کھونٹ نہ ملا۔ دُوسری کھونٹ چھاپہ جا مارا۔ مشکل تو ہماری ہے۔ وہی کہاوت ہے۔ کہ اجگر کے داتا رام۔ ہمیں اَور کون پُوچھے؟ فکر شکار میں ٹیلیاں کے کنارے اس سرے سے اُس سرے تک پڑے پڑے اٹھوارے گذر جاتے ہیں۔ اور کچھ نہیں ملتا۔ ایک ایک جوان بندر کے لئے آدھی آدھی رات پیڑ پر چڑھنے میں گذر جاتی ہے۔ اور پھر خالی پیٹ کھسکنا پڑتا ہے۔ جنگل کا یہ حال ہے۔ کہ لکڑی میں ذرا جان نہیں۔ ایک روکھ ہماری جوانی کے تھے۔ کیسے ہرے بھرے لکڑی

کے مضبوط۔ ایک آج کل کے ہیں۔ کہ ایندھن بھی ان سے اچھا ہوتا ہے ٭

بھالو پنجے جوڑ کر بولے "ست بچن مہاراج۔ پیڑ تو اب بھی خاصے ہیں۔ یہ کہئے کہ آپ ہی کا وزن بڑھ گیا ہوگا"؟

اژدہا ہنس کر بولا "وزن تو خیر کیا رہا ہے۔ قویٰ البتہ اچھے ہیں۔ اور وہ بھی اچھے کیا ہیں۔ یہ کہئے کہ بڑوں کا نام قائم ہے۔ اور سچ پوچھئے تو قصور قویٰ کا ہے نہ وزن کا۔ ساری خرابی اس نئی پود کے جنگل کی ہے جو ہمارے تمہارے دیکھتے جوان ہوا ہے۔ اگلے وقتوں کے بن کہیں ایسے ہوا کرتے تھے؟ تھوڑا ہی عرصہ گذرتا ہے۔ کہ ایک دن گرتے گرتے بچا۔ جڑ پر دم جما کر پیڑ پر چڑھتا تھا۔ تھوڑی ہی دور پہنچا تھا۔ کہ جڑ چٹخی اور جڑ کے چٹخنے ہی دم نے گرفت چھوڑ دی۔ جب جڑ کا یہ حال ہو۔ تو ڈالوں کا کیا حال پوچھنا ہے۔ سب کی سب جھکنے لگیں۔ لاچار بے قابو ہو کر پھسلنا پڑا۔ پھسلنے کی آواز سنتے ہی بندر ہوشیار ہو گئے۔ اور مجھے دیکھتے ہی ایسے ایسے ناشائستہ الفاظ زبان پر لائے ہیں۔ کہ اب تک غصے سے بدن کا جوڑ جوڑ ٹوٹ رہا ہے۔ کہ اگر ان بندروں کو کہیں پالے۔ تو ایک ایک کا رس نکال کر پھوک کی طرح پھینک دے ٭

بگھیرا یہ سنتے ہی کچھ مونچھوں ہی مونچھوں میں بڑبڑا اٹھا "ارے واہ رے کیڑے۔ تجھے بھی کیا دن لگے ہیں"! اس کی کچھ اچٹتی سی بھنک اژدہے کے کان میں بھی پڑی۔ اور جھٹ پھن اٹھا کر بولا۔

"ہیں! یہ کیا لفظ آپ نے کہا۔ پھر تو کہئے"؟

بگھیرا۔ جی کچھ نہیں۔ ان شریر بندروں کے ناشائستہ الفاظ کچھ یاد آ گئے تھے۔ حقیقت میں نہایت گستاخ ہوتے جاتے ہیں۔ مجھے بھی کچھ یاد پڑتا ہے۔ کہ کوئی ایسا ہی سخت لفظ مٹّی کا یا مٹّی سے بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کا نام رکھا ہے ٭

اژدہا غصے سے پھول اٹھا۔ اور پھنکارے مار کر پوچھنے لگا "کیا نام رکھا ہے۔ پھر تو کہو۔ مٹّی کا کون؟ یہ لفظ اور ہماری شان میں اور وہ بھی بندروں کے منہ سے"!

بگھیرے نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا "جی ہاں۔ کوئی ایسا ہی لفظ تھا۔ پچھلے ہی چاند کا تو ذکر ہے۔ کم بخت نہایت بے باک ہو گئے ہیں۔ پرسوں ہی دوپہر کو پیڑوں میں بیٹھے پرچے دوڑا رہے تھے۔ کہ آپ کے دانت ٹوٹ گئے ہیں۔ اور آپ بالکل پوپلے ہو گئے ہیں اور سوائے بکری کے بچّے کے وہ بھی جو دودھ پیتا ہو۔ اب آپ کسی چیز کے قابل نہیں رہے۔ کیا عرض کروں۔ یہ بندر نہایت بے ادب

Taj Tahir Foundation

اور گستاخ ہیں۔ روز بزرگوں کا مضحکہ کرتے ہیں۔ خود ہی سوال کرتے ہیں۔ اور خود ہی جواب دیتے ہیں۔ ایک صاحب نے آپ کی اس معذوری کی وجہ پوچھی۔ تو دوسرے صاحب بولے۔ کہ اگر آپ پہاڑی بکرا نگل جاتے ہیں۔ تو سینگ حلق میں پھنس جاتے ہیں۔ اور پھر آپ کی بری گت بنتی ہے۔ اور اس بات پر یہ نامعقول سب قہقہے لگا کر ہنسنے لگے۔

اژدہے کے غصے کو پہچاننا ذرا مشکل ہے۔ لیکن دونوں شکاری تاڑ گئے۔ کہ مطلب نکل آیا۔ اژدہے کے گلپھڑے کبھی پھولتے ہیں کبھی پچکتے ہیں۔ اور نتھنوں سے بھاپ نکلنے لگی ہے۔

جب ذرا پھنکاروں کی دھونکنی ٹھہری۔ تو اژدہے نے بھالو سے پوچھا "معلوم ہوتا ہے۔ آج بندروں نے کسی طرف کوچ کیا ہے۔ تھوڑی دیر ہوئی پیڑوں میں غل سا ہو رہا تھا؟"

بھالو۔ جی ہاں۔ ان ہی بندروں کے پیچھے تو ہم بھی خاک چھان رہے ہیں۔

بھالو نے یہ فقرہ کہنے کو تو کہہ دیا۔ لیکن بندر کا نام حلق میں اٹکا سا گیا۔ جیسے کسی نے گلا پکڑ لیا ہو۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ جنگل کے کسی شریف جانور نے بندروں کے افعال سے باضابطہ بحث کی ہو۔

اژدہا۔ ہائیں۔ آپ اور بندروں کا تعاقب؟ خود شکاری نہ سہی۔ مگر شکاریوں کے اُستاد۔ دونوں صاحب جنگل کے شریف زادے اپنی اپنی قوم کے سردار۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ معلوم ہوتا ہے کوئی نہایت سخت مرحلہ درپیش ہے؟

بھالو نظریں نیچی کرکے بولے "جی۔ کس کا شکار اور کس کی شرافت۔ یہ ناچیز تو محض ایک بھوری رنگت کا ریچھ ہے۔ اور اب تو ریچھ بھی نہ رہا۔ بقول شخصے 'یک مُشتِ پشم'۔ وہ بھی از پُشتِ میش' رہ گیا ہے۔ سیونی کے جنگل میں بھیڑیوں کی اولاد کو پڑھاتا ہے۔ ایک مسکین سا معلّم ہے۔ جس سے آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی حماقت ہوتی رہتی ہے۔ البتّہ یہ میرے ساتھی بے چارے . . . ."

بگھیرا کسرِ نفسی کا قائل نہ تھا۔ جھٹ مُنہ پھاڑ کچلیاں نکال زمین پر پنجہ مار بیچ میں بول اُٹھا۔ "ایں جانب فقط بگھیرے ہیں۔ یکّہ کلہ وچہار جنگل۔ کورے سپاہی۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا"۔ یہ کہہ کر کھٹ سے مُنہ بند کر لیا۔ اور اژدہے سے للکار کر کہا۔ کہ "اے اژدہا کوہسار! سُن لے۔ ہماری داستان بہت مختصر ہے۔ تیرے ان بندروں نے کہ پیڑوں کے رہزن۔ پھل پھلواریوں کے چور۔ باغوں کے لُٹیرے اور جنگل کے قزّاق ہیں۔ ہمارا آدمی کا بچّہ چُرا لیا ہے

جس کو ہم نے بڑے شوق سے پالا تھا۔ اور اس آدمی کے بچّے کا حال تو نے بھی ضرور سنا ہوگا"۔

اژدہا۔ اچھا اچھا۔ کہیں اُسی جانور کے بچّے کو تو آپ نہیں کہتے جس کا ایک دن ساہی ذکر کرتی تھی۔ ساہی! وہی کانٹوں والی خارپُشت کی ساس جو جھڑبیری میں رہتی ہے۔ کم بخت لڑائی کا گھر ہے۔ دُنیا بھر کے قصّے اس کی زبان پر رہتے ہیں۔ مگر آج تک بات پُوری سُننی آئی نہ کہنی۔ وہ ایک دن کانٹے پھیلائے دھوپ میں بیٹھی کہہ رہی تھی۔ کہ سیونی کے بھیڑیوں نے آدمی کا پلّا پالا ہے۔ بات تو میرے کان میں بھی پڑی تھی۔ مگر یقین نہ آیا۔

بھالُو۔ مگر اب یقین کر لیجئے۔ وہ بچّہ آدمی کا بچّہ ہے۔ اور بچّہ بھی ایسا جس کی مثل آج تک جنگل نے نہیں دیکھا تھا۔ نہایت عاقل و زیرک۔ اور پھر میرا شاگرد ہے۔ جو اُستاد کے نام کو جب تک اس سنسار میں سیونی کا جنگل قائم ہے روشن رکھے گا۔ اور اس کے علاوہ مجھ کو اور نہ صرف مجھ کو بلکہ ہم دونوں کو اس معصوم بچے کے ساتھ غایت درجہ الفت بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ عشق ہے!

اژدہا۔ عشق۔ پھو پھو۔ کس مرض کا نام لیا۔ ہم بھی اس آزار میں مدّتوں مُبتلا رہے ہیں۔ اس کے قصّے ہم سے سُنئے ع

کوئی میرے دل سے پُوچھے تیرے تیرِ نیم کش کی

بگھیرا۔ قصّے تو جناب کو بے شک بہت یاد ہونگے۔ لیکن اُن کے کہنے اور سُننے کا لُطف تو جب ہے کہ چاندنی رات ہو۔ وہ بھی پُورے چار پہر کی۔ نرم اور لذیذ شکار سے شکم ہائے احباب تا بحلقوم پُر ہوں۔ پھر فتراکِ بلا کے اسیروں کا تڑپنا اور لوٹنا ہماری زبان سے سُنئے۔ اس وقت مضمونِ واحد ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ ہمارا آدمی کا بچّہ بندر اُٹھا لے گئے۔ اور بندر آپ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ جس طرح ہو سکے ہمارا بچّہ ان سے دِلوا دیجئے۔

اژدہا۔ خوب! خوب! اس کو تو پھر آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ بندر میرے سوا کسی کا خوف نہیں کرتے۔ اب آپ سے ان بندروں کا حال کیا عرض کروں۔ جنگل میں کوئی مخلوق ان سے زیادہ احمق مغرور اور یاوہ گو۔ ان سے بڑھ کر خود بیں۔ خود ستا و خود نما نہیں۔ بہتیرا چاہتا ہوں۔ کہ ان کو تمیز سکھاؤں۔ لیکن سوائے اس کے کہ اپنا ہی معدہ خراب کر کے بیٹھ رہوں۔ ان پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بندر کے ہاتھ آرسی۔ کچھ شک نہیں کہ اس بچّے کی آج بُری گت بنی ہوگی۔ پھل جن کو وہ بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ جب ان کو توڑتے توڑتے اکتا کر پھینک دیتے ہیں۔ درخت کی ایک معمولی شاخ جس کو ایک جگہ سے گھسیٹ کر

Taj Tahir Foundation

دُوسری جگہ لے جانے میں آدھا آدھا دن گنوا دیتے ہیں۔ اور پھر اس کو نوچ کھسوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ تو پھر ایسی عجیب چیز جیسے آپ کا آدمی کا بچہ ہے۔ اُن کے ہاتھوں سے کب سلامت رہ سکتا ہے؟ افسوس! ہاں ذرا یہ تو فرمائیے۔ میری نسبت ان شُہدوں نے کیا لفظ کہا تھا۔ بُھول بھول جاتا ہُوں؟"

بگھیرا چلا کر بولا "کیڑا کیڑا۔ اور کیڑا بھی ...... خیر مٹّی ہی کا سمجھئے۔ ایک بات ہو تو کہی جائے۔ بیسیوں باتیں آپ کی نسبت مشہور کر رکھی ہیں۔ مُجھے تو کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔"

اژدہا۔ اچھا اچھا! اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ خود ہی تماشا دیکھ لیجئے گا۔ کہ ان گستاخوں کو کس طرح تمیز سکھاتا ہوں۔ بہت دنوں سے بُھولے بیٹھے ہیں۔ یہ بتائیے کہ اس بچّے کو کس طرف لے گئے ہیں؟

بھالُو۔ جنگل میں جانے کدھر لے گئے ہیں۔ جدھر سُورج ڈُوبتا ہے۔ اُدھر کچھ پتہ چلتا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے۔ کہ آپ کو سب خبر ہوگی۔

اژدھا۔ مجھے بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے۔ مَیں ایسے کمینوں کے پیچھے تو پھرتا نہیں۔ رستے میں کہیں دس پانچ مل گئے تو کھا لئے۔

Taj Tahir Foundation

کیا آپ سمجھے تھے۔ کہ ایسے ذلیل شکار کے لئے مجھے کوئی تردّد کرنا پڑتا ہے؟

سُراغ

"چل چل چلو چلو۔ بھالو اُوپر دیکھ۔ بگھیرے اُوپر دیکھ!"

بھالو نے گردن اُٹھا کر اوپر دیکھا۔ تو چیل چکّر باندھے نیچے اُتر رہی تھی۔ شہ پروں کے سفید استر پر سورج کی کرن ہے۔ گردن اور پُشت کے پَر ہوا سے پریشان ہیں۔ منقار جھکی ہے۔ بسیرے کا وقت قریب ہے۔ اور پُورا ایک پہر ہونے کو آیا ہے۔ کہ بھالو کو جنگل میں ڈھونڈتی پھری ہے۔ اب شام ہوتے پہاڑ پر نظر پڑی۔ تو بھالو کو آواز دے کر نیچے اُترتی ہے کہ مظلوم قیدی کا پیغام سُنا دے۔

بھالو گھبرا کر دونوں پنجوں پر کھڑا ہو گیا۔ اور چیل زنیل دے کر بولی۔ "بھالو سیونی والے سُن لے۔ کہ تیرا زُلفی بندروں کی قید میں ہے دریا پار سرد ویرانوں کی طرف جہاں کہ انسان کا بنایا ہوا ایک شہر صحرا کے دامن میں ویران پڑا ہے قیدی کو لے گئے ہیں۔ یہ نہیں معلوم۔ وہاں کب تک قیام ہو۔ شپّر کو رس سے کہہ آئی ہوں۔ کہ جب تک جنگل میں اندھیرا ہے قافلہ کی نقل و حرکت سے خبردار رہے۔ اور

Taj Tahir Foundation

بس یہ ہی خبر تھی جو سُنانے آئی تھی۔ اب مَیں جاتی ہوں۔ بسیرے کا وقت
قریب ہے۔ بچّے روتے ہونگے"۔

بھالو جی تو اتنی خبر سُنتے ہی خوشی سے بے دم ہو کر خاک پر گر پڑے اور بگھیرا سُراغ پا کر چیل سے کہنے لگا "اے چیل! چیلوں کی ملکہ! جب تک جنگل آباد ہے۔ تُو اور تیرے بچّے سلامت رہیں۔ فلکِ کوہ پر آشیانہ بلند رہے۔ اُونچی سیج پر سونا نصیب ہو۔ پوٹے میں چارہ۔ پروں میں قوّت۔ پنجوں پکڑے اور چونچوں کھائے! جو سلوک آج تُو نے ہمارے ساتھ کیا ہے۔ جنگل تجھ کو اس نیکی کا اجر دے! اب کے جس دن ہرن شکار کیا۔ دل و جگر تیری نذر کروں گا"۔

چیل۔ اتنا شرمندہ نہ فرمائیے۔ میرا اس میں کون سا بڑا کام تھا۔ تعریف تو اس لڑکے کی ہے۔ کہ دُور سے دیکھتے ہی مجھے پہچان لیا۔ اور اپنا سارا حال سُنا دیا۔

اور یہ کہہ کر چیل بسیرے کے لئے آشیانے کی طرف اُڑ گئی۔

بھالو فرطِ طرب میں خاک پر لوٹ پیٹ کر پوستین جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔ تو بگھیرے سے کہنے لگے "دیکھئے۔ دیکھئے۔ کیا ذرا سی جان ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ اور پھر بھی منتر نہ بھولا"۔

بگھیرا۔ کیوں نہیں۔ بھلا آپ کے یاد کرائے ہوئے منتر جیسے

سر میں میخیں ٹھونک دیں۔ مجال ہے دماغ سے نکل جائیں! اب خیر سے کھڑے ہو جائیے۔ اور سرد ویرانوں کی طرف کوچ بول دیجئے"۔

اس جگہ کو سیونی کا بچّہ بچّہ جانتا تھا۔ کہ کہاں ہے۔ لیکن یہ مقام ایک ویران شہر تھا۔ جس کے چاروں طرف بن کھڑا ہو گیا تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں انسان کی بُود و باش تھی۔ مگر اب کچھ عرصہ سے بندروں نے باوجود اس زمانہ بدوشی کے اپنا مولد اور مسکن مشہور کر دیا تھا۔ اس لئے سوائے لومڑیوں اور گیدڑوں کے جنگل کا کوئی شریف شکاری جانور وضع کا پابند اس ویرانے کے پاس تک نہ پھٹکتا تھا۔ البتہ گرمی کے موسم میں جب جنگل میں پانی کا قحط ہو جاتا۔ تو یہاں کے پُختہ تالابوں اور سنگین حوضوں سے جن میں برساتی پانی کسی قدر باقی رہ جاتا تھا۔ بعض درندے پیاس بُجھانے چلے آتے تھے۔ اور غالباً یہی وجہ تھی۔ کہ یہ برباد شہر سرد ویرانوں کے نام سے جنگل میں مشہور ہو گیا تھا۔

بھالو چلنے کو تیار ہُوا تو بگھیرا بولا "گرو جی۔ چلنے کو تیار تو ہو گئے۔ کچھ منزل کی بھی خبر ہے؟ پوری آدھی رات دوڑنا پڑیگا"۔

بھالو نے کہا "تم چلو تو۔ آج بھی ان ہاتھ پاؤں نے کام نہ دیا۔ تو پھر کس دن کام کریں گے"؟

بگھیرا۔ بجا ہے۔ یہ کہئے۔ کہ اَور دِن تو کچھ کام دے بھی

Taj Tahir Foundation

جلتے۔ آج کیا کام دیں گے۔ بہتر یہ ہے کہ میں اژدہے کے ساتھ
چلتا ہوں۔ آپ پیچھے آتے رہئے گا۔ پاؤں تو اژدہے کے بھی نہیں
ہیں۔ مگر خیر ہم دونوں کسی طرح پہنچ رہیں گے۔

اژدہا یہ سُن کر بولا "واہ کیا خوب! پاؤں ہوں یا نہ ہوں۔ اپنے
سے چار بانس آگے دیکھ لینا"۔

یہ کہہ کر بگھیرے کے ساتھ اژدہا بھی چل پڑا۔ بھالو بھی کچھ دور
ساتھ چلا۔ مگر تھک کر بیٹھ گیا۔ اور اب اژدہے اور بگھیرے میں دوڑ
شروع ہوئی۔ اژدہا مُنہ بند کرکے شائیں شائیں کرتا تیر کی طرح چلا۔
بگھیرا بھی اُچھلتا کودتا چوکڑیاں بھرتا روانہ ہوا۔ جب کبھی سوچتا تھا۔ کہ
آگے نکل گیا ہوں اژدہے کو دس قدم اپنے سے آگے ہی پاتا تھا۔
کہ اتنے میں پہاڑی ندی زور سے بہتی ہوئی رستہ میں آئی۔ بگھیرا
ایک چھلانگ میں پار پہنچا۔ اژدہے کو پانی میں اُترنا پڑا۔ اور مُشکل
سے تیر کر بہت دیر میں کنارے پر نکلا۔ بگھیرا اتنی دیر میں بہت
آگے بڑھ گیا تھا۔ مگر اژدھا ایسا اُڑا۔ کہ تھوڑی ہی دیر میں بگھیرے
کو جا پکڑا۔

شام تو ہو گئی۔ آسمان پر شفق پھولی۔ اور سارا جنگل گلابی ہو گیا۔
گلابی روشنی میں اژدہے کی چمک دمک دیکھ کر بگھیرا لوٹ گیا۔ اور

اور رفتار کی تیزی پر عش عش کرکے اژدہے کی تعریف میں قسمیں
کھانے لگا۔ کہ قسم ہے اُس قفلِ زندان کی جس کو ایک پنجہ میں توڑ کر
اسیری سے آزاد ہُوا ہوں۔ کہ اس طول طویل قدوقامت پر آپ کی
مثل تیز گام نہیں دیکھا۔

اژدہا۔ جی ہاں بُھوک بُری بلا ہے۔ اور جب غصّہ بھی ساتھ
ساتھ ہو۔ ہاں ذرا پھر تو فرمائیے کہ ان بندروں نے میری نسبت
کیا کہا تھا؟ مینڈک یا مچھلی؟ وہ خاص لفظ کیا تھا؟

بگھیرا دوڑتے دوڑتے یکایک تھم گیا۔ اور چلّاکر بولا "بیس دفعہ تو
عرض کر چکا ہوں۔ کتنی دفعہ سُنئیے گا؟ اب پھر سُننے کو جی چاہتا ہے۔ تو
سُنئے اور کسی قدر تفصیل سے سُنئے۔ حشرات الارض میں سے ایک
نہایت حقیر اور ادنیٰ جاندار کا نام جو آپ کی طرح مُنہ جماکر نشست اُٹھاکر
دم کے سہارے سے آگے بڑھتا ہے۔ آپ کو بطور خطاب کے ملا
ہے۔ آپ کے اس ثقلِ سماعت نے تو احقر کو بہت ہی گستاخ کر دیا
ہے۔ اب کہاں تک صاف صاف عرض کروں؟ کیڑا اور وہ بھی
مٹی کا نہیں بلکہ مٹی سے بھی بدتر کسی چیز کا کیڑا آپ کو کہنے لگے
ہیں۔ اور پھر کیڑے کا رنگ بھی سُنہری یا روپہلی نہیں۔ بلکہ گہرا
کرنجوا مائل بہ سیاہی بتاتے ہیں"۔

Taj Tahir Foundation

اژدہا - اچھا - بس بس اب ذکر نہ کیجئے - منزل کھوٹی ہوتی ہے + اور اتنا کہہ اژدہا قریب سے قریب رستہ دیکھتا ہوُا اس زور سے جھپٹا کہ خود تو کیا نظر آتا - رہگذر پر کوسوں تک گرد و غبار کی ایک سیدھی دیوار اُٹھی نظر آتی تھی ۞

سرد ویرانوں کے باشندے

اب زُلفی کا حال سُنئے - کہ جب سرد ویرانوں میں بندروں کا قافلہ اُتر لیا - تو بندروں کو خیال تک نہ رہا - کہ آج اس معصوم بچے کے پیچھے جنگل کا کوئی شریف خاک چھانتا ہوگا - ان کے نزدیک اس سخت مہم کا یہ ہی نتیجہ کافی تھا - کہ زلفی وطن سے آوارہ ہوکر اس خرابہ میں آزاد کر دیا جائے - اور خود رنگ رلیوں میں مصروف ہو جائیں + زلفی نے آج تک ہندوستان کا کوئی شہر نہ دیکھا تھا - ان ویرانوں پر نظر پڑی تو ہر چیز خوش نما معلوم ہوئی - کسی زمانہ میں کوئی بڑا راجہ تھا - جس نے ایک پُر فضا سرسبز پہاڑی پر اس شہر کو آباد کیا تھا + لیکن مُدت سے انسان کا وہاں گذر نہ رہا تھا - جنگل نے چاروں طرف سے اس کو گھیر لیا تھا - اور خودرَو درختوں نے اس کی شاندار عمارتوں کو چند روزہ حُسن دے کر غارت

کرنا شرُوع کر دیا تھا ۞

اکثر عالی شان محلوں کے کچھ کچھ حصّے باقی تھے + شہر کے اُونچے اُونچے دروازے شکستہ حال اب تک موجود - اور بُرجیاں اُن پر قائم تھیں + پُختہ روشوں کے آثار کہیں کہیں دکھائی دیتے تھے - دیواریں جگہ جگہ سے پھُوٹی پڑی تھیں - جہاں سے پتّھر اُکھڑے تھے - وہیں کوئی جنگلی بیل یا خودرَو درخت پھُوٹ نکلا تھا - اور اس کی ہریاول در و دیوار پر چھائی تھی ۞

کہیں کہیں کسی شکستہ دیوار کے سایہ اور درختوں کے جھُرمٹ نے مل جُل کر تنہائی کے گوشے نہایت دلچسپ بنا دئے تھے + شہر پناہ کے کنگورے اکثر گر گئے تھے - اور جو نہیں گرے تھے وُہ گرنے کو تھے اور تھوڑی دُور پر فصیلوں کے بُرج بھی شق ہو کر آدھے آدھے خندق میں پھسل پڑے تھے + بُرجوں کے ستونوں پہ ہری ہری بیلیں لپٹی ہوئی تھیں - اور دریچوں میں سے جنگلی درختوں کی شاخیں باہر نکل کر ہر وقت ہوا کے جھونکوں سے جھومتی تھیں ۞

خندق میں کہیں کہیں برسات کا پانی بھرا تھا - اور اس میں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں - پیاری جانیں اُچھل اُچھل کر چاندی کے پتّروں کی طرح چمکا کرتی تھیں - اور نہائے دھوئے جل کوّے صُبح سے شام تک

Taj Tahir Foundation

ان کے فراق میں پانی کے اوپر اوپر ہوا میں پھرکیوں کی طرح پھرا کرتے، دس
پانچ ڈبکیوں میں دو چار مچھلیوں نے پوٹا بھر دیا۔ تو خوش ہو کر اُڑ جاتے
کہ دوسرا پانی دیکھیں ٭

ویرانہ کے بیچوں بیچ پہاڑ کی چوٹی پر راجہ کا محل تھا۔ چھت کبھی
کی گر چکی تھی۔ فقط در و دیوار باقی تھے۔ محرابیں موجود تھیں، خشک نہر
کے کنارے چوپڑ کا فرش اور سنگِ مرمر کے فوارے ٹوٹے پڑے
تھے۔ درختوں کی جڑوں نے فرش کے پتھروں کو توڑ پھوڑ کر ناہموار
کر دیا تھا۔ اور سنگِ مرمر کی بیلوں پر سبز اور سرخ داغ پڑ
گئے تھے ٭

محل کے چبوترے پر مہتابی کے پاس کھڑے ہو کر دیکھو تو چاروں
طرف کالی کالی دیواریں دکھائی دیتی تھیں۔ چھت کسی مکان کی باقی نہ
رہی تھی۔ پختہ سڑکوں کے کنارے جہاں اب گڑھوں میں پتھروں کے
ڈھیر پڑے تھے۔ یہ کسی وقت میں بڑے بڑے اندارے اور پن گھٹ
تھے۔ یہاں پیاری پیاری لڑکیاں جن کے ہنسنے بولنے کے دن تھے
آپس میں چہلیں کرتی پانی بھرا کرتی تھیں ٭

چوراہے پر جو ایک بے ڈول سا پتھر کا ٹکڑا پڑا ہے، یہ کسی
دیوتا کی مورتی تھی۔ جس پر روز صبح سویرے پھولوں کے ہار چڑھا کرتے

تھے ٭

وہ ٹوٹا بُرج جہاں پیپل کے بہت سے چھوٹے بڑے درخت
اُگ آئے ہیں۔ جن کے پتے دھوپ میں چمک چمک کر ہوا کے
جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں، یہ اس شہر کا عالیشان مندر تھا۔
یہاں صبح شام سنکھ اور گھنٹے بجتے تھے۔ پجاریوں کے میلے لگے
رہتے تھے ٭

مگر اب وہ صورتیں کہاں؟ نہ راج رہا نہ پاٹ۔ بستی کے
بسنے اور بسانے والے سب خاک میں مل کر خاک ہو گئے۔ اب تو
یہ ایک ویرانہ ہے۔ اور اس پر بندروں کی حکومت کا ڈنکا۔ کہ
رات دن پڑا بجتا ہے ٭

وہ اس شہر کو اپنا شہر مشہور کرتے اور خود شہری بن کر جنگل
والوں کو دہقانی بتاتے ہیں۔ مگر آج تک ان مسخروں کی سمجھ میں
یہ نہ آیا۔ کہ یہ محل اور مکانات کس نے بنائے تھے۔ اور کیوں بنائے
تھے۔ اور ان میں کس طرح رہنا چاہئے، مگر زعم یہی تھا۔ کہ ہم ہر
بات میں انسان کی نقل اتار سکتے ہیں ٭

راجہ کے دربار میں جہاں کبھی درباریوں کا ہجوم رہتا تھا سینکڑوں
بندر ایک کے پیچھے ایک بیٹھ جاتا۔ اور بجائے اس کے کہ رموزِ

Taj Tahir Foundation

سلطنت پر سرگوشیاں ہوں۔ ایک کی جوئیں ایک دیکھ دیکھ کر کھاتا تھا۔ اور اس شغل میں اس درجہ محو ہوتے۔ کہ تھوڑی دیر میں سب کا جی گھبرا اُٹھتا۔ اور فوراً آنکھ مچولی شروع ہو جاتی ٭

بیس بیس تیس تیس بندروں کی ٹولیاں بندھ کر ادھر گھس اُدھر بیٹھ شروع ہو جاتی۔ دس بندر دالان میں گھس کر پنجے میں آئے ہیں تو پانچ کا پنجے سے اُچک شہ نشین پر پہنچے۔ ایک جوڑا چھجّے پر سے کود صحنچی کے طاق میں سردی کھاتا۔ تو دوسرا زینہ سے چڑھ سرا پردہ برآمد ہو تخت پر ناچ دکھاتا۔ اور اس غریب بوڑھے بندر کو چھیڑتا۔ جو سائبان کے قلابے میں تنِ تنہا لٹکا کچّے گولروں کی یاد میں مصروف ہے۔ غرض دس دس کے پیچھے بیس بیس اور بیس کے پیچھے تیس تیس بندر تھے۔ کہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر بھاگ رہے ہیں ٭

کبھی کبھی بہت اہتمام سے چونے کے ٹکڑے دیواروں سے اکھیڑ کر صدر کی جانب دیوانِ خاص کے گوشے میں جمع کیے جاتے ہیں۔ کبھی صحن چبوترے کی اینٹیں نکال نکال کر ان کے ڈھیر سنگ مرمر کے تخت پر چُنے جاتے ہیں۔ اور پھر اس کثرتِ کار میں قوّتِ حافظہ یک بخت معطل ہو جاتی ہے۔ اور یہ بھول کر کہ چونے اور اینٹوں

کے خزانے کہاں جمع کیے تھے۔ تفتیش شروع ہوتی۔ اور دورانِ تفتیش میں خفیف سی رنجشیں پیدا ہو کر دفعتًہ اس زور کی لڑائی ٹھنتی۔ کہ سینکڑوں بندر لہو لہان ہو جاتے۔ اور بندریاں بچّوں کو کلیجے سے لگا دُور جا بیٹھتیں ٭

پھر کوئی خیال یکایک ایسا پیدا ہوتا۔ کہ تیس تیس چالیس چالیس بندروں کی گروہ بندی ہو جاتی۔ اور سب کے سب پائیں باغ میں جا کودتے۔ جہاں ابھی تک پھولوں اور میووں کے درخت خودرَو حالت میں پھولا پھلا کرتے تھے ٭

ایک غول رنگتروں میں سے نکل کر ناشپاتیوں میں پہنچا۔ تو دوسرا امرودوں سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ میں جا کودا۔ ایک نے چمن کی روش پر گلاب کے تختوں کو روند مارا۔ تو دوسرا محض گھاس پر لوٹنے لگا۔ درختوں کو ہلا ہلا کر پھلوں کی بوچھاڑ پر ہنسیاں ہو رہی ہیں۔ اور پھولوں کے ستھراؤ پر قہقہے لگ رہے ہیں ٭

باغ و چمن تو خیر اپنی جائداد تھے۔ محلوں میں بھی کوئی تہ خانہ کوئی بھول بھلیاں۔ کوئی تاریک سرنگ کا راستہ ایسا نہ تھا۔ جس کو اُنھوں نے بار بار تحقیق نہ فرمایا ہو۔ لیکن خاک یاد نہ رہتا تھا۔ کہ کون سی چیزیں دیکھ چکے ہیں۔ اور کون سی دیکھنی باقی ہیں ٭

Taj Tahir Foundation

اور پھر دو دو چار چار مل کر گردن میں باہیں ڈالے محلوں میں ٹہلتے پھرتے اور فخر کرتے۔ کہ جس طرح آدمی یہاں آباد تھے۔ اور اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ اسی طرح ہم بھی اس شہر میں آباد ہوئے ہیں۔ پُختہ تالابوں اور سنگ مرمر کے پاکیزہ حوضوں سے پانی پیتے۔ اور تھوڑی دیر میں نرمل جل کو گندا کر کے کیچڑ کر دیتے۔ اور پھر پانی پر لڑائیاں ہوتیں جو خشکی کی لڑائیوں سے ہرگز کم نہ تھیں۔

اور ابھی ان لڑائیوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا تھا۔ کہ اپنی تعریفوں کے گیت شروع ہو جاتے۔ قصیدے پر قصیدہ پڑھا جاتا۔ کلام میں اِس بلا کی شورش ہوتی تھی۔ کہ چیختے چیختے آوازیں بیٹھ جاتیں۔ اور ممدوحین کی چندیاں مداحین کے پنجوں کی داد دیتے دیتے گنجی ہو جاتی تھیں۔ اور پھر یہی سب حرکتیں۔ اور ان کے متعلق مضامین از سر نو شروع ہو جاتے۔ یہاں تک کہ اس شہر کے ٹوٹے محلوں اور اُجڑے باغوں سے بیزار ہو کر پیڑوں پر چڑھ سب کے سب جنگل کو نکل جاتے۔ اور دِل میں ارمان ہوتا تھا۔ کہ جنگل والے ہم کو کچھ سمجھنے لگیں۔

آزاد قیدی

زلفی جس کی حیوانی و جسمانی تعلیم صحرا کے سخت قوانین کے مطابق ہوئی تھی۔ وہ ایسی نامعقول زندگی کو کب پسند کر سکتا تھا؟ اس ویرانے میں آئے ہوئے پورا ایک پہر ہونے کو آیا تھا۔ منزل بھی بہت سخت طے کی تھی۔ مگر کسی بندر نے آرام کیا نہ زلفی کو تھوڑی دیر سونے دیا۔ آتے ہی سب نے ناچ رنگ شروع کر دیئے۔ اربابِ نشاط کی کیا کمی تھی؟ طائفہ پر طائفہ کھڑا ہو کر اس غضب کی دھرپتیں اُڑانے لگا۔ کہ حال کا پتہ چلتا تھا نہ قال کا۔ غُل تھا۔ اور بھورے بھورے بندر تھے۔ کہ ایک کا ہاتھ ایک کی دُم۔ چاروں طرف اُچھل رہے تھے۔

اِتنے میں ایک صاحب کی جو کم بختی آئی۔ دو پاؤں پر کھڑے ہو اِدھر اُدھر منڈیا پھیر۔ دیدے جھپکا اسپیچ کہنے لگے "اے بھورے بالوں والی بیگموں اور اے لال مُنہ والے سردارو! زلفی کی گرفتاری ہماری قدیم تاریخ میں ایک نیا عہد شروع کرتی ہے۔ آپ کو علم ہوگا کہ یہ آدمی کا بچہ آج کس محنت اور کوشش سے گرفتار ہُوا ہے لیکن

Taj Tahir Foundation

افسوس ہے۔ کہ تہذیب و ترقی تو درکنار۔ بندروں کو اپنی آسائش و آرام کا بھی خیال نہیں! اس فخر سے کیا ہوتا ہے۔ کہ ہماری قوم اب تک حیواناتِ عالم کی بعض قوموں میں سب کی مورثِ اعلیٰ مانی جاتی ہے۔ کوئی ہنر سیکھ کر دکھاؤ تو جانیں۔ ورنہ سلام ہے آپ کی اس بزرگی اور قدامت کو۔ یہ بچہ انسان ہے۔ اور انسان کو کیا نہیں آتا؟ کیا عجب ہے۔ کہ اس وقت ہم ہی میں کوئی بڑا بوڑھا بندر ایسا بھی موجود ہو۔ جس کی کمر پر بندر والے کی رسی کا نشان اور جس کے کانوں میں اب تک ڈگڈگی کی صدائیں گونج رہی ہوں بہتر ہے۔ کہ وہ اُٹھے اور بتائے کہ وہ کون سے ہنر ہیں جو انسان کو نہیں آتے"؂

زلفی نے اتنی ہی تقریر سنی تھی۔ کہ ڈر کر موٹی موٹی گھاس کے دس پانچ پٹھے توڑ لئے۔ اور ان میں جلدی جلدی انگلیاں چلانے لگا۔ جیسے کوئی بوریے والا بوریا بنتا ہو؂

بندروں پر کچھ تو تقریر کا اثر ہوا۔ اور کچھ اس نئے کھیل کو دیکھ کر سب کے سب زُلفی کی نقل اتارنے لگے، مگر کب تک؟ تھوڑی ہی دیر میں گھبرا گئے۔ اور سب کو یک لخت اِس زور کا خفقان اُچھلا۔ کہ ایک بندر نے دوسرے بندر کی دُم پکڑ کر بے اختیار

کھانسنا شروع کر دیا۔ اور جن صاحب نے تقریر کی تھی۔ اُن کی تو وہ بُری گت ہوئی۔ کہ اگر کبھی ملاقات ہو۔ تو بس اُن ہی سے پُوچھئے گا؂

بھوک کے مارے زُلفی کی جان نکلی جاتی تھی۔ جب بالکل ضبط نہ ہو سکا۔ تو دو چار بندروں سے اُس نے کہا۔ کہ "میں بھوکا ہُوں۔ یا تو خود کھانے کو دیجئے۔ یا شکار کی اجازت ملے کہ زمین آپ کی ہے اور میں پردیسی"؂

اتنا سُنتے ہی جوشِ مہمان نوازی سے بے تاب ہو کر تیس چالیس بندر دیواریں پھاند باغوں میں جا کُودے۔ اور پکے پکے پھلوں کی بھری ڈالیاں توڑ کر گھسیٹتے ہوئے لاتے تھے۔ کہ رستے میں لڑائی ہو پڑی۔ اور اس زور کی ہوئی۔ کہ اس کے بعد پھلوں کو سمیٹ کر زلفی تک پہنچانا بندروں کے بس کی بات نہ رہی؂

زلفی سخت پریشان تھا۔ بدن پہ بیسیوں نیل پڑے ہوئے نیند کے مارے بُرا حال۔ اور بھوک کے مارے غصہ بڑھتا جاتا تھا۔ شہر کے ویران گلی کوچوں میں پڑا، شکار کے لئے پردیسی کی صدا لگاتا۔ مگر کہیں سے جواب نہ ملتا، اب اس کی سمجھ میں آیا۔ کہ اس سے بدتر جگہ جنگل میں کہیں نہ ہوگی۔ اُستاد نے جو کچھ

Taj Tahir Foundation

فرمایا تھا۔ وہ سب سچ نکلا، یہ بندر حقیقت میں بڑے ہی نالائق۔ نامنجار ہیں۔ اُن کے ہاں نہ کوئی برادری کا قانون ہے نہ شکار کا دستور العمل۔ اور پھر اس جگہ کا کوئی چودھری نہیں۔ کہ جس سے فریاد کیجیے، زبان رکھتے ہیں محض چیخنے کے لئے۔ اور ہاتھ ہیں جن کی انگلیوں نے سوائے چوری کرنے اور چٹکیاں لینے کے کوئی ہنر نہیں سیکھا، اگر میں یہاں بھوکا مرگیا۔ یا کسی جانور نے مار ڈالا۔ تو کسی کا قصور نہیں۔ اپنی ہی خطا ہے، کیا کروں جو جنگل میں پھر پہنچ جاؤں؟ موقع ملے تو بلا سے بھاگ ہی جاؤں۔ بھالو پیٹیں گے تو بہت۔ مگر ان بندروں کے ساتھ کب تک بیٹھا گل کترا کروں گا؟"

یہ سوچ آنکھ بچا زلفی فصیل کی طرف چلا، دیوار پر چڑھ گیا تھا کہ بندروں نے دیکھ لیا اور دوڑ کر پکڑ لائے۔ اور سمجھانے لگے کہ بے وقوف تجھ کو اب تک اپنے بُرے بھلے میں تمیز کرنی نہ آئی دیکھ تو یہاں کیسا خوش ہے۔ کس حال سے کس درجہ تک ہم نے تجھ کو پہنچایا۔ پھر بھی ہمارا احسان نہیں مانتا۔"

زلفی کچھ بولنے کو تھا۔ لیکن بندروں نے اس خیال سے کہ آئندہ یہ لڑکا اپنے کسی محسن کا احسان نہ بھولے۔ اُس کے چٹکیاں لینی شروع کر دیں، زلفی زبان سے کچھ نہ بولا۔ مگر غصہ سے دانت

پیستا تھا۔ کہ اتنے میں دو چار موٹے موٹے بندروں نے اس کو پکڑ لیا۔ اور گھسیٹتے ہوئے تال کی طرف لے گئے۔

یہ تال اس ویرانے میں عجیب منظر تھا۔ محل کے ایک طرف اونچا بند باندھ کر بیچ میں بڑا تالاب بنایا تھا۔ چاروں طرف سنگِ سرخ کی سیڑھیاں تھیں۔ اور چوڑے بند پر پتھروں کا فرش۔ پاکیزہ چشموں اور آبدار نہروں کا پانی تو اب اس تالاب میں کہاں سے آتا۔ برسات کا پانی البتہ نشیب میں کچھ بھرا رہتا تھا۔ باقی حصہ جو خشک پڑا تھا اس میں موٹی موٹی گھاس اور نرسل کھڑے ہوگئے تھے۔ اور تال کے بیچ میں سنگِ مرمر کی ایک بارہ دری تھی۔ جس میں رانیاں اور راج کماریاں جھروکوں میں بیٹھ کر تال کی سیر کیا کرتی تھیں۔

اوپر کا برج شق ہوگیا تھا۔ اور اس کا آدھا ٹکڑا اندر آپڑا تھا۔ اور اس کے ملبہ سے وہ سرنگ کا رستہ جو تال کے نیچے نیچے محل سے بارہ دری میں آنے کا تھا بالکل اَٹ گیا تھا، چاروں طرف خوب صورت ستونوں اور محرابوں میں سنگِ مرمر کی جالیاں قناتوں کی طرح لگی تھیں، جالیوں کو چھوڑ کر در و دیوار پر پچی کاری کا کام تھا۔ ہر پھول میں عقیق و یشب اور ہر پتے میں سبزے اور

Taj Tahir Foundation

فیروزے جڑے تھے۔ جالیوں کو دیکھیئے۔ تو سنگ تراش کے ہُنرمند ہاتھوں نے ایک سحر کیا تھا۔ سخت پتھر کو تراش کر پھول پتّوں کی نوک پلک ایسی نزاکت سے نکالی تھی۔ کہ جس وقت مہتاب نے پہاڑ کے دامن سے بلند ہو کر ان جالیوں پر اپنی روشنی ڈالی۔ تو تاریک فرش پر اس کا عکس ایسا پڑا جیسے کسی نے سیاہ کاشانی مخمل پر کافوری ریشم کا کارچوبی کام کیا ہو ؎

زلفی ایسا خستہ حال ہو رہا تھا۔ کہ ہنسنے بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مگر بندروں کے افعال و اقوال ایسے ناشائستہ اور عجیب تھے کہ بے اختیار ہنسی آ جاتی تھی ؎

زلفی جوں ہی تال کے کنارے پہنچا بندر بھی وہاں آنے شروع ہو گئے۔ اور اب سب نے مل کر اس کو نصیحتیں کرنی شروع کیں، بہت سے بندر حلقہ باندھ کر اس کے گرد کھڑے ہو گئے۔ اور کہنے لگے "سنو سنو۔ ہم جنگل میں سب کے اُستاد ہیں۔ طبیعتیں آزاد ہیں۔ مزاج بے تکلف ہیں۔ چُست ہیں۔ چالاک ہیں۔ دماغوں میں فطانت ہے۔ حواسوں میں تیزی۔ دیدے گول ہیں۔ دُمیں شریر ہیں۔ جنگل میں ہم سے بڑھ کر کوئی چنچل نہیں۔ ہم غیرتِ صحرا اور رشکِ جبل ہیں۔ اور اپنی نسبت ہم سب کا یہی خیال ہے۔ اور اِس لئے

ہمارا خیال صحیح ہے۔ پس تم کو چاہیئے کہ ہماری خُو بُو۔ رگ و پے عادات و خصائل سے آگاہ ہو جاؤ۔ تاکہ جنگل میں ہماری تعریف کر سکو۔ اور جنگل میں رہنے والے ہماری عزّت کو اپنا فخر سمجھنے لگیں"۔

زلفی کو سوائے ہاں ہاں کرنے کے چارہ ہی کیا تھا؟ بندروں کا اژدہام بڑھتا جاتا تھا۔ اِکائیاں دہائیاں۔ سینکڑے کب کے ختم ہو گئے تھے۔ اب تو ہزاروں اور لاکھوں پر نوبت تھی۔ قافلے پر قافلہ اور کارواں پر کارواں تھا۔ کہ چلا آتا تھا۔ تال کی سیڑھیوں پر۔ پختہ گھاٹوں کے اُونچے چبوتروں پر ہزاروں کڑکیت کڑکا رہا تھا۔ اگر چیختے چیختے کسی کا دم ٹوٹ جاتا تھا۔ تو سامعین اس وقفہ کو اپنے گلو خراش نعروں سے پُر کر دیتے تھے۔ اور اس شورِ بے ہنگام کا سلسلہ کہیں ختم نہ ہوتا تھا ؎

زُلفی اِس عمل کو سُن کر گھبرایا جاتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا۔ ہو نہ ہو کسی باؤلے گیدڑ نے ان بندروں کو کاٹ کھایا ہے۔ کیا عجب ہے کہ میاں طباقی وارفتہ مزاج ہو کر اس راہ سے گزرے ہوں۔ اور اس وقت ان بندروں کو ہڑک اٹھی ہو + دیکھیئے رات کو بھی سوتے ہیں یا یوں ہی رت جگا رہتا ہے۔ آہا ہا۔ یہ آسمان پر بادل کا ٹکڑا کیسا آیا۔ اور دیکھو چاند کی طرف پھر پھر اُڑا چلا آتا

Taj Tahir Foundation

ہے۔ ایک ذرا اَور بڑا ہوتا تو اندھیرا ہوتے ہی یہاں سے نکل جاتا۔ لیکن ہاتھ پاؤں تو چُور ہو رہے ہیں۔ بھاگا کس سے جائے گا؟

بگھیرے کا دھاوا

اور اسی بادل کے ٹکڑے کو زلفی کے دو دوست شہر پناہ کے سایہ میں کھڑے خندق سے دیکھ رہے تھے۔ کہ کب چاند چھُپے۔ اور وہ شہر میں داخل ہوں۔ اژدہے کے ساتھ بگھیرے کی ہمت بھی نہیں پڑتی تھی۔ کہ بندروں کی اتنی بے شمار جمعیت پر یوں ہی بے سوچے سمجھے حملہ کر بیٹھیں۔ جنگل کے شکاری جانور بندروں کا حال خوب جانتے تھے۔ کہ بندروں کا بھی یہ اصُول تھا کہ جب تک ایک دُشمن کے مقابلے میں سَو نہ جمع ہو جائیں۔ مقابلہ نہ کرتے۔ پھر ایسے بہادروں کو جنگل میں کون پُوچھتا؟

اژدھا دیوار کے نیچے نیچے دور تک پھیلا پڑا تھا۔ کہ پھن اُٹھا کر بگھیرے سے بولا "لیجئے بندۂ درگاہ تو رخصت۔ شہر پناہ کے دوسری طرف کچھ حصہ دیوار کا میرے چڑھنے کے قابل ہے۔ اور اُترتے وقت ایسی ڈھلوان زمین مل جائے گی۔ کہ چُپ چاپ موقع پر پہنچ

جاؤں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ اور خبر ہوئی بھی۔ تو بندہ میری پیٹھ پر کُود کر کان کاٹنے سے تو رہے۔ البتہ آپ کو کسی قدر......"

بگھیرا۔ جی ہاں میں سمجھا۔ پُشت و شکم کا مضمون تو اس وقت خارج از بحث ہے۔ کمزوروں سے زور آزمائی اپنا شیوہ بھی نہیں مگر کچھ ایسی ہی بات آپڑی ہے۔ بھالو بھی اس وقت ساتھ ہوتا تو بہتر تھا۔ خیر وہ ہو یا نہ ہو۔ ذرا یہ بادل کا ٹکڑا چاند پر آجائے۔ تو بندہ آپ سے پہلے جان کھونے کو مستعد ہے۔ معلوم ہوتا ہے تال کے کنارے مشورے ہو رہے ہیں۔ غل تو دیکھئے کس بلا کا ہے"

اژدہے نے پوری بات بھی نہ سُنی اور کھسکنا شروع کر دیا۔ اور شہر پناہ کی دوسری طرف پہنچ پتھروں کو دیکھتا بھالتا دیوار پر چڑھنے لگا۔ اس عرصہ میں بادل کا ٹکڑا چاند پر آگیا۔ اور زلفی دل میں کہنے لگا۔ کہ دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔ کہ پتھروں پر پنجوں کی آہٹ سُنی۔ فوراً سمجھ گیا کہ بگھیرا کمک کو آیا ہے"

چاند کے چھُپتے ہی بگھیرا ٹوٹی فصیل پھاند کر دوڑتا ہوا اس صفائی سے گھاٹ پر پہنچا۔ کہ دم تک نہ ٹوٹا۔ کاٹنے اور نوچنے میں

Taj Tahir Foundation

اوقات ضائع کرنی تو بگھیرے کو آتی نہ تھی۔ دشمن پہ پہنچتے ہی زُلفی کے گرد بندروں کے دل بادل میں پنجے اور ناخن سے خنجر و شمشیر کا کام لینے لگا۔ کوئی جنگل ایسا نہ تھا۔ کہ طمانچہ نہ چلاتا ہو۔ اور کوئی ناخن نہ تھا۔ کہ ایک اشارہ میں دو چار بندروں کی رُوح نہ کھینچ لیتا ہو۔ شور پر ایک اَور شور خوف و عتاب کا پیدا نہ ہوا تھا۔ کہ سینکڑوں بندر زخمی ہو کر خاک پر پڑے ہاتھ پاؤں پیٹنے لگے۔ اور بگھیرا بندروں کی رُوئی سی دھنکتا لاشوں کو روندتا کچلتا آگے بڑھنا چاہتا تھا۔ کہ ایک نے للکار کر کہا۔ "یارو کیوں جانیں مفت میں کھوتے ہو۔ دشمن فقط ایک ہے اور ہم لاکھوں"

اس للکار کے سُنتے ہی اُتر کے گھاٹوں سے بندروں کی ایک بلاخیز موج تڑپتی اور لوٹتی سمٹتی اور بکھرتی ایسی تیرہ و تار آئی۔ کہ بگھیرا بندروں کے اس گرداب میں چھُپ کر نظر سے غائب ہو گیا۔ اور دس بارہ بندر دوڑتے ہوئے زلفی کی طرف آئے اور اس کو پکڑ کر کسی رستہ سے تال کے بیچ بارہ دری کے بُرج پر لے چڑھے۔ اور جہاں سے بُرج ٹوٹ گیا تھا وہاں سے زلفی کو دھکا دے بارہ دری کے اندر گرا دیا۔

زلفی نے اگر آدمیوں میں پرورش پائی ہوتی۔ تو پانچ چھ گز

کی بلندی سے گر کر ہڈیاں چکنا چُور ہو جاتیں۔ لیکن جنگل کا تعلیم یافتہ تھا جس طرح بھالو نے گرنا سکھایا تھا۔ اسی طرح پنجوں کے بل زمین پہ آیا۔

بندروں نے چلا کر کہا۔ "بس آدمی کے بچے۔ اسی جالیوں کے پنجرے میں بند پڑا رہ۔ اگر کالے کوڑیالوں نے جیتا چھوڑ دیا۔ تو تیرے حمایتی کا خون پی کر دیکھ تیری بھی کیسی خبر لیتے ہیں۔ بوٹیاں کر کے قیمہ نہ بنایا ہو تو بندر نام نہیں"

زُلفی کے قدم زمین تک پہنچے ہی تھے۔ کہ ہر کالے موکھے میں سے ایک کوڑیالا اور ہر پتھر کے نیچے سے ایک افعی کا بچہ پھنکارتے مارتا نکل آیا۔ زلفی نے فوراً سانپ کا منتر پڑھا۔ اور کہا "یارو میں دوست ہوں۔ دشمن نہیں۔ مدت سے بن باس ہو کر بھیڑیوں کا بھائی بنا ہوں"

اتنی بات کہتے کہتے صدہا ناگ زلفی کے گرد پھن پھیلا پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ زلفی نے ڈر کے مارے پھر منتر پڑھا۔ اور سانپوں سے پناہ مانگنے کے لئے پردیسی کی صدا لگائی۔

صدا کے سُنتے ہی کالے کوڑیالوں کا سردار للکار کر پھنکارا۔ "جوانو! پھن سمیٹ کر فوراً منڈیاں زمین پہ ڈال دو۔ اور اپنے حکم

Taj Tahir Foundation

کھوؤں میں چُھپ جاؤ۔ اور اے جنگل کے مسافر سُن لے۔ کہ جہاں کھڑا ہے اسی طرح کھڑا رہ کہ ہم تیرے پاؤں میں کُچل نہ جاویں "

زلفی جہاں کھڑا تھا وہیں دم سادھے کھڑا رہا۔ اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جالیوں میں سے دیکھتا تھا۔ کہ اس گھمسان میں کہیں بگھیرے کا پتہ بھی چلتا ہے یا نہیں۔ کہ اتنے میں بندر رُوئی کے گالوں کی طرح چاروں طرف اُڑتے نظر آئے۔ اور بگھیرا دُشمنوں سے لڑتا بھڑتا۔ آگے بڑھتا۔ پیچھے ہٹتا۔ دولتیاں جھاڑتا پنجہ و ناخن سے دُشمن کے پرخچے اُڑاتا۔ گردنیں چبا چبا کر دائیں بائیں لاشوں کو پھینکتا بندروں کے غبار میں سے کچھ کچھ دکھائی دیا۔ زخمیوں کی چیخیں۔ مُردوں کا ماتم۔ زندوں کی بھپکیاں۔ ایک شور تھا۔ کہ زلفی کے کان پھٹے جاتے تھے۔ ہزاروں گلے تھے۔ کہ بھینچتے بھینچتے بیٹھ گئے تھے۔ اور بتیسیاں تھیں کہ دانت پیستے پیستے گھس چلی تھیں۔ اور یہ جنگل کا پہلا معرکہ تھا۔ کہ نسل پلنگ کا ایک شریف زادہ اور وہ بھی کالے رنگ کا بگھیرا ایک ذلیل دُشمن کی بے شمار جمعیت سے شوقِ شکار میں نہیں بلکہ محض اپنی جان بچانے کے لئے جنگل میں لڑا ہو۔

زلفی نے بگھیرے کو دیکھتے ہی دل میں سوچا۔ کہ بگھیرا اکیلا

نہیں آیا ہے۔ بھالو بھی ضرور کہیں آس پاس ہوگا۔ یہ سوچتے ہی زُلفی نے جالیوں کے پاس منہ لا کر بگھیرے کو آواز دی۔ کہ "بگھیرے بگھیرے جس طرح ہو پانی کے پاس پہنچ کر غوطہ لگا لو۔ پھر دشمن کچھ نہ کر سکے گا"

زلفی کی آواز بگھیرے نے سُنی۔ اور سُنتے ہی اُس کی ہمت دوچند ہو گئی۔ اور اب بگھیرے نے پانی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ بندروں نے روکنا چاہا۔ اور ایک ایک قدم پر بیسیوں اپنی جانیں فدا کرنے لگے۔ لیکن بگھیرا برابر سیڑھیاں اُترتا رہا۔ کہ سمتِ صحرا کی دیوار سے کالے سے کمبل کا ایک دقیانوسی جھنڈا بلند ہوا۔ اور بھالو کا نعرۂ جنگ جیسے اُونچے پیڑ میں کھٹکھٹا بندھا ہو۔ سب کے کانوں تک پہنچا۔ زُلفی سُنتے ہی اُچھل پڑا۔ کہ اُستاد آن پہنچا۔ اب فتح میں کس کو کلام ہے؟

کمک

اس ضعیفی میں بھالو بیچارے کو ایسی مصیبت کب اُٹھانی پڑی تھی؟ اپنی بساط سے زیادہ تیز چلا۔ پھر بھی اتنی دیر میں پہنچا۔ کہ بگھیرا لڑتے لڑتے گھبرا گیا تھا۔ اور اب شہر پناہ کی منڈیر سے بھالو للکارتے

"بھیّا بگھیرے۔ خبردار جی نہ چھوڑیو۔ میں آن پہنچا ہوں۔ دیکھ یہ دیوا

Taj Tahir Foundation

پر چڑھا۔ اور یہ پیچھے دھم سے کودا۔ اور اب تیرے پاس پہنچا۔ دل پر ذرا میل نہ لائیو۔ ایک پہرا ذرا انتظار اَور کرلے۔ اے بندرو۔ بے ایانو تم کس دن جنگل سے غارت ہوگے "

اس آواز کے چپ ہوتے ہی دیوار سے وہ جھنڈا بھی غائب ہوگیا۔ اور گھاٹ پر ریچھ کی منڈیا ابھری ہی تھی۔ کہ بندروں کا ایک بگولا اٹھا۔ اور بھالو جنگل کا گرو اس میں غائب ہوگیا۔ مگر بھالو نے بھی عمر بھر لونڈے پیٹے تھے۔ جھٹ پٹھوں کے بل بیٹھ دم کے سہارے سے چکر کاٹنے لگے۔ اور دونوں پنجوں سے بندروں کو بھوسی کی طرح چھاج میں پھٹکنا شروع کردیا۔ کہ اتنے میں پانی میں کوئی چیز دھم سے گری۔ اور چھینٹوں کے اڑنے کی آواز ہوتے ہی زلفی سمجھ گیا۔ کہ بگھیرا دشمن سے رستہ نکال کر پانی میں پہنچ گیا۔

بگھیرے نے تال میں اترتے ہی سارا بدن پانی میں چھپا لیا۔ فقط منہ باہر نکلا رہنے دیا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ اس عرصہ میں سینکڑوں بندر گھاٹ کی سیڑھیوں پر صف بستہ ہوگئے۔ اور بالکل تیار تھے۔ کہ اگر ریچھ کی مدد کے لئے بگھیرا پانی سے نکلے۔ تو نکلتے ہی اس کا کام تمام کردیں۔ اور یہ وقت وہ تھا۔ کہ بگھیرے نے تھوڑی تک منہ نکال کر جس سے خون اور پانی کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک

رہی تھیں۔ اژدہے کو آواز دی۔ اور جب جواب نہ ملا۔ تو سمجھ گیا۔ کہ آج اس لمبے لپھی نے عین وقت پر دھوکا دیا۔ آخرکار مجبور ہوکر پانی کے سانپوں سے پناہ مانگنے کے لئے صدا لگائی۔

بندروں کا وہ ہجوم تھا۔ کہ بھالو کو دم لینے کی مہلت نہ تھی۔ لیکن بگھیرے کی صدا کان میں پڑتے ہی دل پر ایک چوٹ سی لگی اور کہنے لگا "سچ ہے بڑے بول کا سر نیچا۔ یہ وہی بگھیرا ہے جس کو اپنے پنجہ و ناخن پر ناز تھا۔ آج ایسا معذور ہوگیا۔ کہ مٹی چاٹ کر خاک پر لوٹنے والوں سے پناہ مانگ رہا ہے"

اب راجی اجگر کا حال سنئے۔ کہ سیدھی دیوار پر پتھروں کی رخنیں پکڑتے ہوئے لہریا کاٹتے مشکل سے منڈیر تک پہنچے۔ اور مٹی کے پتھر میں دم اٹکا کر دوسری طرف اترنے شروع ہوئے۔ کمر تک زمین پر پہنچے تھے۔ کہ ہلکا سا جھٹکا دے کر پتھر سے دم چھڑائی۔ مگر وہ ہلکا سا جھٹکا بھی اس غضب کا تھا۔ کہ منڈیر کا پتھر باہر کی طرف خندق میں گر کر دو ٹکڑے ہوگیا۔

جب زمین پر پورے تیس فٹ اتر لئے۔ تو دیر تک کنڈلیاں مار مار کر تہ ہوتے اور کھلتے رہے۔ اور گردن سے لے کر دم تک ایک ایک جوڑ کو جانچ لیا۔ کہ زنجیر کی کوئی کڑی کسی کانٹے سے نکل

Taj Tahir Foundation

تو نہیں گئی ۔ عین وقت پر دھوکا نہ دے جائے ؎

جب بالکل اطمینان ہو گیا ۔ کہ پھن سے لے کر پورے نو گز سولہ گرہ تک جہاں دُم کے ساتھ خود بھی ختم ہوتے تھے ۔ کیل کانٹے سے درست ہیں ۔ تو اب یہ تردّد پیدا ہوُا ۔ کہ بندر اگرچہ حقیر دشمن ہے ۔ لیکن پھر دُشمن ہے ۔ لڑائی کا موقع ہے ۔ کہیں کسی بات میں کوئی کسر نہ رہ جائے ۔ اور اس سوچ بچار میں اژدہے نے بُہت سا وقت ضائع کیا ؎

لڑائی کا حال اس وقت بُہت نازک تھا ۔ اِدھر تال کی سیڑھیوں پر بندر بگھیرے کے مقابلہ میں تُلے کھڑے تھے ۔ اُدھر گھاٹ پر پھالوں کی دھجیاں اُڑ رہی تھیں ۔ غرض ہر طرف ہنگامۂ کارزار ایسا گرم تھا کہ شپّر کور نے طائرانِ شب بیدار کے ایلچی گھر کو دوڑا دِئے ۔ اور جنگل میں لڑائی کی خبر ایسی گرم ہوئی ۔ کہ گجپال ہاتھی نے بھی پہاڑ کی گھاٹی سے سنکھ پھونکا ۔ اور بندروں کی منتشر فوجیں جو دو دو چار چار کوس پر پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں ۔ ہوشیار ہو کر پیڑوں پیڑوں منزل بہ منزل مارتی دوستوں کی کمک کو چل پڑیں ۔ اور لڑائی کے شور نے صحرا کے پرندوں کو جو درختوں کی ڈالیوں میں بیٹھے بسیرا لیتے تھے گہری نیند سے جگا دیا ۔ اور وہ دیس میں بیٹھے پردیس کی لڑائیوں

کے چرچے سُن سُن کر چیں چیں کرنے لگے ؎

اور اب وُہ وقت آیا ۔ کہ اژدہا بھی میدان میں آئے ۔ شہرپناہ سے گھاٹ کی شست باندھ کر ایسا چلا جیسے کڑی کمان کا تیر ۔ سیدھا تیز ۔ دُشمن کی ہلاکت پر آمادہ ؎

اجگر کی پُھنکار

شکار کے وقت تو اژدہا شکار پر لپٹ کر بدن کے جوڑوں سے کام لیتا ہے ۔ لیکن لڑائی کے وقت اس کے حملہ کا طریق اَور ہے ۔ چار پانچ ہاتھ سیدھا برچھے یا بلّم کی طرح تُل کر جسم کی پُوری طاقت اور وزن سے دُشمن کے ہُولا لگاتا ہے ۔ یا کمر تک کنڈلی مار کر باقی جسم سے دُشمن کو کوٹ ڈالتا ہے ۔ اس کے حملے کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے ۔ کہ یا تو ایک لوہے کا ہتوڑا وزن میں تیس چالیس من کا ہو ۔ اور اس کی دستگی میں سلامتی عقل و حواس کے ساتھ مثل ایک ذی رُوح کے ضرب لگانے کی قوت موجود ہو ۔ اور یہ ضربیں کسی خاص نشانہ پر لگاتار پڑتی ہوں ۔ معاذاللہ ! یا پُرانے زمانے کا کوئی قلعہ شکن منجنیق ہو ۔ کہ لوہے کا ایک بہت وزنی شہتیر ہوتا تھا ۔ جس کی ٹکر سے قلعہ کی دیواریں توڑ دی جاتی تھیں ؎

Taj Tahir Foundation

اس کہانی کا اژدہا تو پورے دس گز کا تھا۔ اگر اژدہے کا بچہ بھی گز ڈیڑھ گز کا پورے قد کے آدمی کے سینے پر مُنہ مارے۔ تو آدمی چاروں خانے چت زمین پر جا پڑے۔ اور سانس نہ لے۔

اژدہے نے گھاٹ پر پہنچتے ہی پہلا سانٹا اس غول پر مارا جو بھالو کو نوچ کھسوٹ رہا تھا۔ اس کے بعد پھر تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اژدہے کو دیکھتے ہی ہزاروں بندر یک لخت چلا اُٹھے۔ "بھاگو بھاگو اژدہا آگیا" اور بھالو پر سے بندر ایسے پھٹے جیسے پانی پر سے کائی۔

پُشت ہا پُشت سے بندروں نے اژدہے کے ستم کی کہانیاں سُن کر اپنے اخلاق و آداب کی اصلاح کی تھی۔ اژدہا ان کے حق میں موت کے فرشتے سے کم نہ تھا۔ جب سے جنگل قائم تھا۔ بندروں کو پکڑ کر نہایت شوق اور اہتمام سے کھاتا چلا آیا تھا۔ درختوں کا بادی چور تھا۔ جو ڈالوں پر اس طرح چڑھ جاتا۔ جیسے پتھر پر کائی یا دیوار پر سایہ۔ اور پھر درخت پر چڑھنے ہی میں صفائی نہ تھی۔ بلکہ بارہا سُننے میں آیا۔ کہ کسی اُونچے درخت میں ایک ٹوٹی ہوئی ڈال بے حس و حرکت لٹک رہی ہے۔ اور بڑے بڑے پرکھا بندر بھی دھوکا کھا کر اس پر جا کودے اور ڈال ان کو پکڑ کر سٹک گئی۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے چشم دید واقعات بندروں میں اگلے وقتوں سے روایت ہوتے چلے آئے تھے۔ اور کسی بندر کو اس کا علم نہ ہوا کہ اژدہے کی قوت کی کوئی انتہا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ اس کی نظر میں اس بلا کا سحر تھا۔ کہ جہاں بندر پر پڑی۔ اور بندر کی جان آدھی رہ گئی۔

غرض اژدہے کو دیکھتے ہی ایک دم سے بندروں کی گھگیاں بندھ گئیں۔ اور یا تو ہزاروں بندر بکارے گلے صاف چلا رہے تھے یا سب کے سب ہکلاتے ہوئے جان کے خوف سے جدھر مُنہ اُٹھا بھاگ نکلے۔

بندروں کی چھیڑ ہوتے ہی بھالو جی کو بھی دم لینے کی فرصت ملی۔ اگرچہ ان حضرت کی پوستین بگھیرے کی پوستین سے بہت دبیز تھی لیکن لڑائی میں جیسا بُرا درجہ اُس کا ہوا تھا۔ بگھیرے کا نہیں ہوا تھا۔ بندروں کو بھاگتے دیکھ کر اژدہے نے سر اُٹھا کر زور سے الٹا دم کھینچا۔ اور تین فٹ کے نل میں بھاپ بھر کر اس غضب کا پھنکارا مارا۔ کہ کوسوں تک بندروں کے منتشر جرگے جو سرد ویرانوں کی طرف دوستوں کی مدد کے لئے درختوں درختوں دوڑے چلے آتے تھے جہاں تھے وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اور درختوں کی ڈالیاں ان

Taj Tahir Foundation

کے بوجھ سے ٹوٹنے لگیں ؎

پُھنکارے کی خوف ناک آواز کے ساتھ کہیں غل کا نام نہ تھا۔ ایک سناٹا تھا۔ کہ چاروں طرف چھا گیا ؎

زلفی نے جُوں ہی جالیوں میں سے دیکھا۔ کہ بگھیرا پانی سے نکل کر سیڑھیوں پر کھڑا پوستین خشک کرتا ہے۔ بندروں میں پھر ایک دفعہ غل پڑا۔ نیچی دیواروں سے اُچک اُچک کر اُونچی دیواروں پر چڑھنے لگے کچھ ویران بت خانوں میں چلے گئے۔ اور بتوں کی گردنوں میں باہیں ڈال ڈال کر زار قطار رونے لگے۔ بہُت سے فصیلوں پر چڑھ کنگوروں کنگوروں بھاگنے لگے۔ سیکڑوں بچے یتیم ہو گئے۔ ہزاروں بندریاں بیوہ ہو گئیں۔ ایسی خوف ناک تباہی اس قوم پر پہلے کبھی نہ آئی تھی ؎

یہ نظارہ دیکھ کر زلفی نے قہقہے لگائے۔ اور اُلّو کی بولیاں بول کر خوب چھیڑا۔ اور فتح کی خوشی میں ناچ ناچ کر دیر تک گاتا اور بگھیرے کو مبارکباد دیتا رہا ؎

جب دو چار جُھرجُھریاں لے کر بگھیرے نے پوستین خشک کر لی۔ تو سیڑھیاں چڑھ کر اژدہے سے ملاقات کو آیا۔ اور کہنے لگا۔ "واقعی آج آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اب جہاں اس قدر تکلیف گوارا فرمائی ہے تو اس لڑکے کو بھی قید سے رہا کیجئے۔ جس کے لئے یہ سب کچھ ہُوا

ہے۔ مناسب ہے۔ کہ ہم اس کو لے کر یہاں سے روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ اندیشہ ہے۔ کہ بندر پھر حملہ کر دیں گے ؎

اژدھا۔ مجال ہے کسی بندر کی کہ دُم تک ہلا سکے۔ خبردار بندرو جہاں ہو وہیں بیٹھے رہو ؎

اتنا کہہ اژدھے نے پھر اُلٹا دم کھینچ کر پُھنکارا مارا۔ اور تمام ویرانوں میں بندر کی آواز عنقا ہو گئی ؎

اژدہے نے بگھیرے سے معذرت کی۔ کہ "فی الواقع مجھ کو یہاں تک پہنچنے میں کسی قدر عرصہ ہو گیا۔ مَیں نے آپ کی آواز سُنی تھی۔ لیکن ایسا عدیم الفرصت تھا۔ کہ جواب نہ دے سکا۔ مگر مجھے یہ اطمینان تھا کہ آپ کو مدد کی ضرورت تو ہے نہیں۔ ویسے ہی پُکارا ہو گا"؎

بگھیرا یہ فقرہ سُن کر جل گیا۔ اور بولا " لڑائی سخت ہو رہی تھی۔ ممکن ہے طلبِ امداد میں کوئی جُملہ زبان سے بے اختیار نکلا ہو۔ وقت پہ تو آپ جانتے ہیں .... خیر یہ ہی سمجھئے۔ کہ اژدہے کو بھی اُستاد ماننا پڑتا ہے۔ اسے لیجئے۔ بھالو بھی آ رہے ہیں۔ کہو گُرو کہیں چوٹ پھینٹ تو نہیں لگی"؟

بھالو چوٹ پھینٹ تو کیا بتاتے۔ ان کو سرے سے یہ ہی خبر نہ تھی۔ کہ جیتے ہیں یا بزرگوں کی ہڑواڑ میں پہنچ لئے۔ جب بگھیرے

Taj Tahir Foundation

نے پھر پوچھا۔ تو دو چار قدم دوڑ کر پشت و کمر کو بار بار سونگھا۔ اور بہت کچھ تامّل کے بعد بولے "بہت غنیمت سمجھو کہ زندہ ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ آج ان نابکار بندروں کے ہاتھوں اس بوڑھی پوستین کے پرخچے اُڑ کر سینکڑوں ریچھ کے بچے پیدا ہو جائیں گے۔ مگر زندگی تھی۔ جو بچ گیا۔ بابا جی کا دم سلامت رہے۔ آج تو ان ہی کے ہاتھوں جان بچی ہے"۔

اژدھا۔ جان بچانے والا تو کوئی اَور ہی ہے۔ یہ فرمائیے کہ وہ لڑکا کہاں ہے؟

زُلفی کی رہائی

یہ سُن کر زلفی چلّایا۔ اِدھر دیکھئے۔ ادھر! ان جالیوں کے پنجرے میں۔ باہر نکلنے کا رستہ آپ ہی نکالئے گا تو نکلے گا۔ چاروں طرف پتھّر کی اُونچی اُونچی جالیاں ہیں۔ اور سر پر آدھا برج تلا کھڑا ہے۔ کہ اب گرا اب گرا۔

زلفی نے اتنا کہا ہی تھا۔ کہ بہت سے کوڑیالے پھنکارے مار کر بولے "بابا جی۔ بابا جی اس لڑکے یہاں سے نکالئے۔ مور کی طرح ناچ رہا ہے۔ کسی آن نچلا نہیں رہتا۔ ہمارے انڈے بچے سب

کچلے ڈالتا ہے"۔

بابا جی ہنس کر بھالو جی سے کہنے لگے "بھالو جی۔ یہ تمہارا چیلا بڑا اچنبھا ہے۔ جنگل میں کوئی جگہ بھی ایسی ہے۔ جہاں اس کے جاننے پہچاننے والے نہ ہوں۔ اچھا بالکے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو۔ ہم جالی توڑتے ہیں۔ اور اے زہریلے بھائیو۔ تم بھی اپنی اپنی بانبیوں میں چلے جاؤ۔ کہ کسی کے چوٹ نہ لگے"۔

اژدہے نے جالیوں کے گرد چکّر لگایا۔ اور ایک جگہ پتھّر میں زرد سا داغ دیکھ کر اس پر دو چار دفعہ منہ سے ہلکی چوٹ لگائی۔ اور پھر سر کو صاف دو گز اُونچا اُٹھا کر پوری طاقت سے پھن کی پانچ چھ موگریاں ماریں۔ اخیر چوٹ پر جالی پاش پاش ہو گئی۔ اور اُس کے گرتے ہی زلفی گرد و غبار کے بادل میں سے نکل بھالو اور بگھیرے کے بیچ میں آن کودا۔ اور دونوں کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ان کی صورت دیکھنے لگا۔ دونوں صحرائی دوست محبّت سے اس کا مُنہ چاٹنے لگے۔

بھالو نے زلفی سے پوچھا "بیٹا تمہارے کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟"

زلفی بولا "جی چوٹ تو ایسی نہیں لگی۔ مگر بھوک بڑے زور کی لگی

Taj Tahir Foundation

ہے۔ آپ اپنا حال تو کہئے۔ روئیں روئیں سے خون ٹپک رہا ہے"۔

بگھیرا۔ ہمارے ہی روئیں روئیں سے لہو نہیں ٹپکتا ہے۔ بلکہ ہزاروں جسم خاک پر پڑے ہیں جن سے خون کے فوارے چل چکے ہیں۔ اور اتنا کہہ بگھیرے نے بندروں کی لاشوں کی طرف نظر دوڑائی۔ اور خون دیکھ کر ہونٹ چاٹنے لگا۔

بھالو۔ لہو بہا بلا سے۔ زلفی تو جیتا جاگتا مل گیا۔

بگھیرا۔ ملنے نہ ملنے کا حال تو آگے چل کر کھلے گا۔ اب ذرا اپنے کو اتنا تو بتا دیجئے۔ کہ باباجی کو جھک کر سلام کر لے۔ زلفی۔ ادھر دیکھو وہ کون آتا ہے؟ یہی پہاڑ کے اژدہے باباجی اجگر ہیں۔ جن کی بدولت تمہاری جان بچی ہے۔ زخم تو ہمارے گن لینا۔ لیکن بندروں پر فتح پانے کا سہرا ان ہی کے سر بندھا ہے۔ ذرا سنبھل جاؤ۔ اور جنگل کے دستور کے موافق باباجی کا شکریہ بجا لاؤ"۔

زلفی نے مڑ کر نہ دیکھا تھا۔ کہ باباجی خود اس کے پاس آ گئے۔ اور زلفی کے قد کے برابر کھڑے ہو کر پھن کا چتر اس کے سر پر پھیلا دیا۔ اور لال لال دیدے پھرا کر بولے "اچھا یہی وہ آدمی کا بچہ جنگل کا اچنبھا ہے۔ جس کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی؟ جلد تو بہت نازک ہے۔ صورت شکل میں بھی بندروں سے ملتا ہے۔ اچھا بالکے۔ ذرا ہوشیار

رہنا۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ کہ کینچلی بدل کر نکلوں۔ اور جھٹ پٹے میں بندر سمجھ کر کھا جاؤں"۔

زلفی نے فوراً شکاریوں کا منتر سنایا۔ اور کہا "آپ سے کیا ڈروں گا۔ آپ نے تو میری جان بچائی ہے۔ آج سے میرے شکار اپنا شکار سمجھئے۔ باباجی آپ مہا اوزنا رہیں"۔

اژدہا۔ سکھی رہو بیٹا سکھی رہو۔ ہم تو اب بڈھے ہو گئے ہیں۔ تم جوان ہو۔ پر ذرا اس شکار کا نام بتاؤ۔ جسے تم مار کر کھاتے ہو؟

زلفی۔ باباجی شکار تو میں نہیں مارتا۔ ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ پر ہاں۔ جنگل سے ہرنیاں اور پہاڑ سے بکریاں ہانک ہانک کر آپ کے پاس پہنچا سکتا ہوں۔ کبھی بھوک کے وقت جنگل میں آیئے۔ تو تماشا دیکھئے۔ یا اگر کبھی پھندے میں پھنس گئے۔ تو میری صفائی دیکھئے گا۔ کہ کس طرح ایک چٹکی میں بھالو اور بگھیرے کو آپ کے احسان سے سبکدوش کر دیتا ہوں۔

یہ کہہ کر زلفی نے سب کو جھک کر سلام کیا۔

زلفی نے ایسی خوبصورتی سے اپنے بڑے بوڑھوں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ اس کی پیاری باتوں پر سب لوٹ گئے۔ اور بھالو تو ایسا خوش ہوا۔ کہ بار بار گلا صاف کر کے شاباش شاباش کے نعرے

Taj Tahir Foundation

لگانے لگا۔

اژدہے نے زُلفی کے شانہ پر اپنا پھن رکھ کر زلفی کی تعریف کی۔ اور کہا "آفرین ہے اے دل کے مضبوط اور زبان کے شیریں بچے۔ آفرین ہے تیری دانائی کو۔ بس اب تجھ کو بہت دُور جانا ہے۔ جا اور اپنے عزیزوں کے ساتھ جنگل میں خوش رہ۔ جا اور سو رہ۔ کہ چاند ڈوبنے کو ہے۔ اور اب جو کچھ یہاں ہونے والا ہے۔ بہتر ہے۔ کہ تُو اس کو نہ دیکھے"۔

رقصِ اژدر

چاند پہاڑوں کے پیچھے چھُپنے کو تھا۔ گھاٹوں سے لے کر فصیلوں تک ہزاروں بندر منڈیا جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔ اور جہاں تک نظر جاتی تھی۔ شہر پناہ کے کنگوروں پہ بندروں کی صفیں کالی کالی جھالر کی طرح لٹکی چلی گئی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بھالو اُٹھ کر حوض سے پانی پینے گیا۔ اور بگھیرا زبان سے اپنی پوستین سنوار رہا تھا۔ کہ اژدہا زلفی کے پاس سے کھسکا۔ اور دوڑتا ہُوا تال کے کنارے ایک چبوترے سے میدان میں پہنچا۔ اور پہنچتے ہی سر اُٹھا کر مُنہ پھاڑا۔ اور اس زور سے اس کو بند کیا۔ کہ جتنے بندر تھے سب

اژدہے کی طرف دیکھنے لگے۔ اور اب اژدہے نے پکار کر کہا "بندرو بندرو۔ دیکھتے ہو کہ چاند ڈوبتا ہے۔ بتاؤ کہ اتنی چاندنی میں تمہیں کچھ سُوجھتا ہے یا نہیں؟"

صدہا بندروں کی آواز نہایت غمگین جیسے ہوا درختوں میں ہچکیاں لیتی ہو درودیوار سے آئی "اے اژدہے۔ ہاں سوائے تیرے ہمیں کچھ نہیں سُوجھتا"۔

اژدھا۔ اچھا تو اب دیکھو۔ کہ ہم بھوک سے بے تاب ہو کر خاک پر لوٹتے ہیں۔ اور یہ ہمارا وہ ناچ ہے جو بندر کھانے سے پہلے ہم ناچا کرتے ہیں۔

اور اب رقصِ اژدر جو سترہ فاقوں کے بعد اژدہا ناچا کرتا تھا۔ شروع ہُوا۔ ہموار زمین دیکھ کر پہلے بڑے بڑے کنڈل میں پھن کو دائیں بائیں لہرا کر دوڑنے لگا۔ پھر زمین پر مُنہ مارتا ایک کنڈل سے نکل کر دُوسرے کنڈل میں پہنچا۔ اور پھر پہلے کنڈل میں آیا۔ اور جب سب چکّر پُورے کر لئے۔ تو سیدھا ہو کر دُم کے پاس ایک چھوٹا سا حلقہ بنایا اور اس تیزی سے لپٹتا ہُوا گردن تک آیا۔ جیسے کوئی چرخ پر پہیّہ چڑھاتا ہو۔

پھر کچھ دُور تک کھُل کر عجیب عجیب صورت سے پیچ و خم کھا کر

Taj Tahir Foundation

ایک شکل سے دُوسری شکل میں ڈھلنے لگا۔ جسم کے کسی حصّہ کو سکون نہ تھا۔ اور کوئی نقش نہ تھا۔ کہ بنتے ہی بدل نہ جاتا ہو۔ کبھی بدن کو لڑی کی طرح بن کر چُٹیا سی گوندھ لیتا۔ کبھی طرح طرح کے خُوبصورت لہریئے زنجیرے بنا کر خاک پر کشیدہ کاڑھتا۔ کبھی اُلجھ کر بالکل گورکھ دھندا معلوم ہونے لگتا۔ اور کبھی سُلجھ کر اینٹوں کے اُونچے اُونچے ٹھٹے زمین پر لگا دیتا۔ اور کنڈلیوں کے مورچوں پر پھن کا چھتر کھول کھول کر لال لال آنکھوں سے بندروں کی طرف دیکھنے لگتا۔

لوٹنے اور گھسٹنے کی آواز کے ساتھ پُھنکاروں کا لہرا کہیں نہ تھمتا تھا۔ اور تنفّس کا یہ عالم تھا۔ جیسے دیگ میں پانی جوش کھاتا ہو یہاں تک کہ چاندنی مٹنے لگی۔ اور خاک پر لوٹنے کے نشان بھی دھندلے ہو گئے۔ اور تھوڑی دیر میں اندھیرا ہو کر فقط زمین پر کسی چیز کے رگڑنے اور گھسٹنے کی آواز باقی رہ گئی۔

بھالو اور بگھیرا یہ تماشا دیکھتے دیکھتے بالکل پتھر کی مُورتیں بن گئے گردن کے بال سیکوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ حلق ہی حلق میں غرّاتے تھے۔ مگر ہاتھ پاؤں میں حرکت کی قوت باقی نہ رہی تھی۔ زلفی حیران تھا۔ کہ ان دونوں کی یہ کیا حالت ہوتی جاتی ہے۔

اور اب اژدہا کنڈلی کے تھیئے سے پھن اُٹھا کر بولا "بندرو بتاؤ کہ تم بغیر ہمارے حکم کے ہاتھ یا پاؤں ہلا سکتے ہو؟"

شہرپناہ کے کنگوروں سے ایک نحیف آواز آئی "نہیں اے اژدہے۔ ہم بغیر تیرے حکم کے ہاتھ ہلا سکتے ہیں نہ پاؤں"۔

اژدہا۔ اچھا تو ہمارا حکم ہے۔ کہ تمہاری جس قدر صفیں ہیں۔ ایک ایک قدم آگے چلی آئیں۔

اس حکم کے ساتھ بندروں کی تمام صفیں اس سرے سے دوسرے سرے تک بالکل بے اختیار ایک ایک قدم آگے بڑھ آئیں۔ بھالو اور بگھیرا بھی بلا قصد ایک ایک قدم آگے بڑھ گئے۔

اژدہے نے مُنہ پھاڑ کر کہا "اچھا اَور قریب آؤ!" سب کے سب اَور قریب چلے آئے۔ بگھیرے کے ساتھ بھالو بھی آگے بڑھنے کو ہوا۔ زلفی نے دونوں کو زور سے روکا۔ اور اُس کے روکتے ہی دونوں ایسے چونک پڑے جیسے کوئی نیند سے چونکتا ہو۔

بگھیرے نے زلفی کے کان میں کہا۔ کہ "زلفی پیارے۔ میرا شانہ خوب مضبوط پکڑے رہنا۔ اگر چھوڑ دیا۔ تو یوں ہی جیتا جاگتا اژدہے کے حلق میں جا رہوں گا۔ ارے رے رے! زلفی روک روک دیکھ میں چلا۔ اژدہے کا مُنہ کھلا ہے"۔

Taj Tahir Foundation

زلفی گھبرا کر بولا "بھائی بگھیرے۔ بھائی بگھیرے۔ خیر تو ہے؟ تمہیں کیا ہو گیا۔ ایسی پتھرائی آنکھوں سے اژدہے کی طرف کیوں دیکھے جاتے ہو؟ کچھ نہیں ہے۔ زمین پہ سانپ لوٹ رہا ہے۔ تمہارا جی کیسا ہے۔ مُنہ سے کیوں نہیں بولتے؟ اچھا۔ اچھا۔ گھبراؤ نہیں۔ ادھر سے پیٹھ پھیر کر نکل چلو" اور یہ کہتے ہی پیٹھ پھیر زلفی دونوں دوستوں کو شہر پناہ کے ایک سُوراخ سے نکال سیدھا جنگل کو ہو لیا ؃

اُلٹا قانون

شہر سے نکلتے ہی سب کے دم میں دم آیا۔ اور گرُو بولے۔ "افوہ! آج سے جیسی جی چاہے قسم لے لو جو کبھی اژدہے کے پاس جاؤں" اور یہ کہہ کر بھالو سر سے پیر تک تھر تھر کانپنے لگا ؃

بگھیرے نے کہا "بے شک اژدہے کے سامنے ہماری کچھ حقیقت نہیں۔ اگر تھوڑی دیر اَور ٹھہرتے۔ تو تمہاری تو کہتا نہیں۔ مَیں تو اژدہے کے حلق میں کبھی کا پہنچ گیا ہوتا" ؃

بھالو بولا "معلوم نہیں شام تک کتنے اسی رستہ اژدہے کے پیٹ میں پہنچ جائینگے۔ آج اس کو شکار کی کیا کمی ہے۔ اور پھر بندر

جیسا من بھاتا چارہ کہاں ملے" ؃

زلفی ان باتوں کا مطلب خاک نہ سمجھا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی۔ کہ اژدہے کی نظر جانوروں پر کس بلا کا اثر رکھتی ہے۔ بار بار پُوچھتا تھا۔ کہ آپ اس قدر کیوں پریشان ہو گئے تھے۔ وہ بات ہی کیا تھی ایک لمبا سا سانپ زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اور اس کی ناک زخمی ہو رہی تھی ؃

بگھیرا بگڑ کر بولا "ناک زخمی ہو رہی تھی۔ مگر کس کی وجہ؟ یہ تُمہارے کرتوت ہیں۔ کہ اپنوں اور بیگانوں سب کو زخمی کر دیا۔ اژدہے کی ناک ٹوٹی۔ میری اور بھالُو کی پوستین قابلِ رفو نہ رہی۔ اور تمہارا تو ظاہر ہے۔ ایک کھیل تھا۔ اب کس میں دم رہا ہے۔ کہ خوش ہو کر جنگل میں شکار کھیلے؟ اس صدمے سے سنبھلنے کو بھی مہینوں چاہئیں" ؃

بھالو بولا "جانے بھی دو۔ جیتے ہیں۔ تو شکار بھی ہو رہے گا۔ زلفی تو زندہ سلامت مل گیا۔ اَور کیا چاہتے تھے"؟

بگھیرا۔ اس میں کس کو کلام ہے؟ لیکن وقت کا بھی تو خیال کیجئے۔ کہ کس قدر ضائع ہُوا ہے۔ اگر یہی وقت شکار میں صرف ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ میرا درجہ نہ سہی اپنا درجہ تو دیکھئے۔ اب کون

Taj Tahir Foundation

جیتا بیٹھا ہے۔ کہ اس اُدھڑے کمبل کو بیٹھ کر گانٹھے گا؟ پُشت سے
کمر تک بیسیوں جگہ جیتا چمڑا نکل آیا ہے۔ اچھا۔ اور پھر یہ نقصان بھی
سب سہے۔ عزت جو کچھ خاک میں ملی وہ کہاں سے پیدا ہوگی؟ زلفی
آج تُو نے ہمارا وُہ درجہ کیا ہے۔ کہ ہم میں بیان کی طاقت نہیں!
ہم نسل پلنگ کا نام لیوا۔ اور بندروں سے لڑنے میں ایسا گھبرا
جاؤں۔ کہ اژدہے کا نام لُوں۔ اور سانپوں سے پناہ مانگوں؟ اور
اژدہے کا ناچ دیکھ کر ایسا مدہوش اور بدحواس ہو جاؤں۔ کہ تن بدن
کی کچھ خبر نہ رہے؟ یہ وہ باتیں ہیں۔ جو آج سے پہلے نہ کبھی سُنی
تھیں نہ دیکھی تھیں۔ افسوس! یہ جتنی رُسوائی ہوئی ہے۔ تیری
وجہ سے ہوئی ہے۔ نہ تُو بندروں سے آشنائی کرتا۔ نہ ہم اس
حال کو پہنچتے"۔

زلفی نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لیا۔

بھالو کڑک کر بولے "بتاؤ جنگل کی پوتھی اس قصور کی سزا
میں کیا کہتی ہے؟"

بھالو کا جی تو نہیں چاہتا تھا۔ کہ زلفی کو سخت سزا دی جائے
لیکن قانون کی پابندی ہر صورت میں لازم تھی۔ زلفی اپنی حرکتوں پر
پشیمان تھا۔ لیکن پشیمانی سے سزا تو ٹل نہیں سکتی۔ بھالو نے بگھیرے

سے کہا "دیکھو۔ سزا کے وقت اس کا لحاظ رہے۔ کہ لڑکا کمزور اور
نادان ہے"۔

بگھیرا۔ بے شک سزا کے وقت اس کا لحاظ کیا جائے گا لیکن
اس کے قصور میں کچھ شُبہ نہیں۔ زلفی تمہارا جرم ثابت ہے۔ اگر
تم کو کچھ کہنا ہے تو کہو۔ کہ تم کو سزا نہ دی جائے؟

زلفی نے جواب دیا "مجھ کو کچھ نہیں کہنا۔ آپ جو سزا دیں گے
وُہ مناسب ہوگی۔ اور انصاف کا خون نہ ہوگا"۔

یہ سُن کر بگھیرے نے ایک پنجہ اُٹھایا۔ اور ناخن چھپا کر اُلٹے
ہاتھ سے تین چار پیار کے طمانچے لگائے۔ بگھیرے کے نزدیک یہ
بہت پیار کی سزا تھی۔ لیکن سات برس کے بچے کے حق میں یہ سزا
ایسی سخت تھی۔ کہ جیسے کسی مکتب کے لڑکے کو بڑے زور کی مار
پٹی ہو۔

جب مار پیٹ چکی۔ تو زلفی دو چار چھینکیں لے زمین سے اُٹھا۔
اور بگھیرے نے اس کو پیار کر کے کہا "آؤ زلفی آؤ۔ میری پیٹھ
پر لیٹ رہو۔ اور اب ہم گھر چلتے ہیں"۔

جنگل کے قانون میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کہ جہاں کسی قصور کی
سزا مل گئی۔ پھر کسی کے دل میں کچھ غبار نہ رہتا تھا۔

Taj Tahir Foundation

زلفی بگھیرے کی پیٹھ پر لیٹ کر ایسا سویا۔ کہ جب تک تھرن کے بھٹ میں بگھیرے نے اس کو اپنی پیٹھ سے نہ اُتارا۔ وہ بے خبر سوتا رہا۔

ہماری چند زندۂ جاوید مطبوعات

تصانیف سیّد امتیاز علی تاج		دوسرے مصنفین کی کتابیں	
انار کلی	۶ ۰ ۰	کالے گورے	۵ ۰ ۰
محاصرۂ غرناطہ	۵ ۸ ۰	عذرا	۵ ۸ ۰
چچا چھکن	۲ ۸ ۰	عذرا کی واپسی	۷ ۸ ۰
شاہکار تصاویر	۷ ۸ ۰	ہاجرہ	۴ ۸ ۰
قرطبہ کا قاضی	۲ ۸ ۰	قاسم بن سلیم	۶ ۰ ۰
ہیبت ناک افسانے	۲ ۸ ۰	نیک بیبیاں	۶ ۰ ۰
پردہ	۸ ۰	یاسمین	۴ ۰ ۰
تصانیف بیگم حجاب امتیاز علی		بدنصیب	۳ ۱۲ ۰
ظالم محبت	۴ ۴ ۰	تذکرۃ الانبیاء	۳ ۸ ۰
اندھیرا خواب	۴ ۴ ۰	نعمت خانہ	۴ ۸ ۰
میری ناتمام محبت	۲ ۱۲ ۰	صبح ملال شام غم	۲ ۰ ۰
ننھی بیبیاں	۵ ۸ ۰	تصویر خانہ	۶ ۰ ۰

ملنے کا پتہ

دار الاشاعت پنجاب لاہور

Taj Tahir Foundation

قرطبہ کا قاضی

اور
دُوسرے یک بابی کھیل

○

اُردو میں مصنفین نے یک بابی کھیل بہت سے لکھے ہیں لیکن ان میں سے اکثر کی زبان میں ڈرامائی لذت نہیں۔ نہ وہ ایسے ہیں کہ اسٹیج پر پیش ہونے کے بعد کامیاب ہو سکیں۔ اسٹیج پر شوقیہ کام کرنے والوں کی ضرورتوں مشکلوں اور مجبوریوں کو مدِ نظر رکھ کر سید امتیاز علی تاج نے پانچ مختلف نوعیت کے ایسے نفیس پختہ اور کم خرچ کھیل پیش کئے ہیں جن میں سے ایک ایک اسٹیج پر غیر معمولی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اس مجموعے میں ایک ٹریجیڈی۔ ایک کامیڈی ایک سنسنی پیدا کرنے والا کھیل۔ ایک فارس یعنی نقل اور ایک رومانوی کھیل ہے۔ جن شوقیہ کام کرنے والوں کو اسٹیج پر پیش کرنے کے لئے کھیل نہیں ملتے اُن کیلئے ایک نعمت ہے۔

قیمت دو روپے!

دار الاشاعت پنجاب لاہور

۷۔ ریلوے روڈ

ہماری چند زندۂ جاوید مطبوعات

تصانیفِ سید امتیاز علی تاج	قیمت	دُوسرے مصنفین کی کتابیں	قیمت
انارکلی	۶ ۰ ۰	کالے گورے	۵ ۰ ۰
محاصرۂ غرناطہ	۵ ۸ ۰	عذرا	۵ ۸ ۰
چچا چھکن	۲ ۸ ۰	عذرا کی واپسی	۶ ۸ ۰
شاہکار تصاویر	۶ ۸ ۰	ہاجرہ	۴ ۸ ۰
قرطبہ کا قاضی	۲ ۸ ۰	قاسم بن سلیم	۶ ۰ ۰
ہیبت ناک افسانے	۲ ۸ ۰	نیک بیبیاں	[illegible]
پردہ	۰ ۸ ۰	یاسمین	[illegible]
تصانیفِ بیگم حجاب امتیاز علی		بدنصیب	[illegible] ۱۲ ۰
ظالم محبت	۴ ۴ ۰	تذکرۃ الانبیاء	[illegible] ۸ ۰
اندھیرا خواب	۴ ۴ ۰	نعمت خانہ	۴ ۸ ۰
میری ناتمام محبت	۲ ۱۲ ۰	صبحِ ملال، شامِ غم	۲ ۰ ۰
ننھی بیبیاں	۵ ۸ ۰	تصویر خانہ	۶ ۰ ۰

ملنے کا پتہ: دارُالاشاعت پنجاب لاہور

BRARY

Taj Tahir Founda

طباعت سرورق۔ نوروز پرنٹنگ پریس، ساندہ بازار۔ لاہور